Web: www.welayat.com. E-mail: welayatpublications@gmail.com

معرفت نفس

تفسیر المیزان کے آئینہ میں

مولف: حجۃ الاسلام حمید رضا مظاہری سیف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معرفت نفس

(تفسیر المیزان کے آئینہ میں)

مؤلف

حجۃ الاسلام حمید رضا مظاہری سیف

مترجم

حجۃ الاسلام سید نذر امام نقوی

نام کتاب : معرفت نفس

(تفسیر المیزان کے آئینہ میں)

مؤلف : حجۃ الاسلام حمید رضا مظاہری سیف

مترجم : حجۃ الاسلام سید نذر امام نقوی

نظر ثانی : حجۃ الاسلام حیدر مہدی کریمی

طباعت : بار اول

تعداد اشاعت : پانچ سو (۵۰۰) عدد

سال اشاعت : دسمبر ۲۰۱۶ء

قیمت : ایک سو پچاس (۱۵۰) روپے

ناشر

ولایت پبلیکیشنز، نئی دہلی

عرض ناشر

خالق نہج البلاغہ نے دین کا تعارف اس انداز سے کرایا ہے:

"اَوَّلُ الدِّیْنِ مَعْرِفَتُهٗ"۔

دین کی ابتداء اللہ کی معرفت سے ہے۔

دین کی معرفت کا پہلا زینہ پروردگار عالم کی معرفت ہے کیوں کہ جس طرح کائنات و مخلوقات کی ابتداء ذات واجب سے ہے اسی طرح سے دین کا آغاز بھی اسی کی معرفت کے ساتھ ہونا چاہیۓ اور حدیث میں آیا ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ گویا انسان کو دینی معرفت حاصل کرنے کے لئے اپنے نفس کی معرفت لازمی وضروری ہے۔ یعنی انسان کی خودی کی شناخت، رب العالمین کی شناخت کا مقدمہ ہے۔

انسان کی شخصیت کے دو پہلو ہیں:

ایک مادی وجسمانی پہلو اور دسرا روحی ومعنوی پہلو۔

کتاب حاضر معرفت نفس کے سلسلے میں علامہ طباطبائی نے انسان کے دوسرے پہلو یعنی انسان کے روحی ومعنوی پہلو کی شناخت اور اس کے تعارف کے سلسلہ میں آیات الٰہیہ و احادیث طیبہ سے سہارا لیا ہے اور اسی پہلو پر علمی وفلسفی بحث کی ہے۔

خودی کی شناخت یا نفس کی معرفت کی اہمیت وعظمت یوں ہے کہ نفس انسان مختلف مراحل ومنازل اور درجات وطبقات کا حامل ہے اور اس کی شناخت ومعرفت پیچیدہ ودشوار ہے۔

نفس کے ہر مرتبہ و مرحلہ کو کشف کرنے کے لئے مخصوص راہ و رسم اور معین راز و رمز ہے جن کو طے کئے بنا نتیجہ تک رسائی ناممکن ہے جو کبھی تفکر و تدبر، کبھی مطالعہ و تحقیق، کبھی عبودیت و عبادت اور کبھی تقویت ایمان سے حاصل ہوتے ہیں۔

یہ سب کچھ اس انسان کے وجود ذیجود کی عظمت کو بیان کرتا ہے جو کمالِ مطلق اور جمال حق کا آئینہ دار ہے۔

زیر نظر کتاب بہ عنوان ''معرفت نفس'' صاحب تفسیر المیزان حضرت آیۃ اللہ محمد حسین طباطبائی طاب ثراہ کی عظیم تفسیر ''المیزان'' میں بیان شدہ خودشناسی و خداشناسی کے مطالب کا خلاصہ وعصارہ ہے جسے عالم خبیر، محقق بصیر، مترجم شہیر حجۃ الاسلام آقای حمید رضا مظاهری سیف نے نہایت عرق ریزی و جانفشانی کے بعد تالیف کیا ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں تھی جس سے اردو داں طبقہ استفادہ نہیں کرسکتا تھا۔ خدا بھلا کرے کہنہ مشق مترجم حجۃ الاسلام مولانا سید نذرامام نقوی کا کہ انھوں نے عدیم الفرصتی و پیرانہ سالی کے باوجود اسے زیور اردو سے آراستہ کرکے اردو داں حضرات کے استفادہ کے قابل بنادیا ہے۔ اللہ ان کو اس کا اجر عنایت کرے اور مزید قلمی خدمات کا موقع دے۔ آمین

ولایت فاؤنڈیشن اس وقیع کتاب کو طباعت کے بعد سالکان سیر وسلوک و راہیان معرفت نفس کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کررہا ہے اور رب العزت کی بارگاہ میں اس ناچیز خدمت کی قبولیت کا طلبگار ہے۔

ولایت فاؤنڈیشن

فہرست

(پہلی فصل)

(دوسری فصل)

(تیسری فصل)

فصل اول

معرفت نفس کے اصول

معرفت نفس کے اصول

تمہید

انسان جب پیدا ہوتا ہے تو قبل اس کے کہ وہ اپنی آنکھیں کھولے خود اور اپنے حالات سے آشنا ہوتا ہے اور تنہائی اور حیرت واستعجاب سے رو پڑتا ہے، جب بھوک پیاس کا غلبہ ہوتا ہے تو کراہ اٹھتا ہے اور پریشانی ورنج کے موقع پر چیخ پکار کرنے لگتا ہے۔ وہ یہ سب کچھ اپنی سمجھ، ادراک اور خود کی شناخت کی بنیاد پر انجام دیتا ہے۔ یہ ایسی شناخت ومعرفت ہوتی ہے جو سطحی اور ابتدائی ہوتی ہے کہ جس کی بنیاد پر اسے زندگی کی طویل مسافت کو طے کرنا ہوگا اور نشیب وفراز بھری زندگی کو لے کر چلنے کی عادت ڈالنی ہوگی۔

خود کی پہچان یا بالفاظ دیگر معرفت نفس ایک ایسی اجنبی پہچان ہے جو آدمی کے پاس ابتدا سے ہی ہوتی ہے لیکن اس کی جستجو وتلاش تا عمر رہتی ہے۔ یہ ایک ایسا راستہ اور مقصود ہے جو فراموش شدہ ہے اور اس سے قربت ایسی ہے کہ جس کی دوری وفراق کے سبب ساری پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔ معرفت نفس یا خود کی پہچان کی اہمیت وعظمت اس وجہ سے ہے کہ انسان کے نفس کے مختلف مراحل اور طریقے ہیں اور معرفت نفس کا حصول اور اس کی شناخت بہت ہی پیچیدہ ودشوار ہے۔

نفس کے کسی بھی مرتبہ اور مرحلہ کے کشف کرنے کے لئے اس کا اپنا الگ اور خاص مرحلہ ہوتا ہے کہ جس کو گذارے بغیر اس راہ پر چلنے اور راز کو پانے میں کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی

ہے۔کبھی فکر و مطالعہ اور تحقیق یا عبادت و عبودیت اور کبھی ایمان کو قوت و استحکام بخشنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سب انسان کے وجودی عظمت کی بناء پر ممکن ہے جو کمال حق کا آئینہ ہے۔

ای آئینۂ جمال شاہی کہ تویی　　و ای مظہر اسرار الٰہی کہ تویی

بیرون ز تو نیست ہر چہ در عالم ہست　　در خود بہ طلب ہر آنچہ خواہی کہ تویی

انسان کی تخلیق کے بعد کا مقام و مرتبہ اور اس کی عظمت و بلندی کہ خداوند عالم نے جس کی تخلیق کی تکمیل کے بعد اس کی تعریف و توصیف کی، اتنی آسانی اور سادگی سے اس کی توصیف نہیں کی جاسکتی ہے اور ہر کوئی اپنی طاقت و صلاحیت کے بقدر شرابِ معرفتِ نفس کے جام سے استفادہ کرتا ہے۔

این چنین انسان کہ نامش می برم　　تا قیامت من زِ وصفش قاصرم

یہ تحقیق جو آپ کے سامنے حاضر ہے یہ ایک چھوٹا قدم ہے اس بلند نگاہ کی روشنی میں کہ جسے بے مثال دانشور اور بے نظیر عارف نے اپنے آسمان شہود سے اپنے جیسے خاک نشینوں اور خام اندیش انسانوں پر بکھیر دیا ہے تا کہ سب اس کی طراوت سے غفلت کے غبار کو محو و معدوم کر کے دیار معرفت میں دامن ہجرت کو بلند کریں۔

جس شاعر نے یہ مندرجہ ذیل شعر کہا ہے اس نے انسان کے ناشناختہ گوہر نفس کی طرف کتنا اچھا اشارہ کیا ہے ؎

تو بہ قیمت ورای ہر دو جہانی　　چہ کنم قدر خود نمی دانی

دیگر مخلوقات پر انسان کی برتری

دیگر مخلوقات پر انسان کی برتری و سرافرازی کی بنیاد اس کی معرفت اختیار کرنے کی ظرفیت و توانائی پر استوار ہے:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِيْ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلاً﴾[1]

یقینی طور پر ہم نے بنی آدم کو کرامت و شرافت عطا کرتے ہوئے بہت سی مخلوقات پر انہیں برتری عطا کی ہے۔

''اکرام و تکریم کا مقصد عنایت کو مخصوص کرنا اور ایسی خصوصیت کو شرافت دینا ہے کہ جو دوسروں میں نہ ہو اور اسی خصوصیت کی بنیاد پر ''تکریم'' و ''تفضیل'' میں فرق ہوجاتا ہے کیوں کہ تکریم نفسی مفہوم و مطلب کا پتہ دیتا ہے اور تکریم میں دوسرے کا عمل دخل نہیں ہے بلکہ صرف محترم و مکرم شخص مورد نظر ہوتا ہے۔

یہ تفضیل کے برخلاف ہے کہ جس کا مقصود دوسروں سے مورد تفضیل شخص کا موازنہ اور دوسروں پر اس کو برتری عطا کرنا ہوتا ہے حالانکہ وہ دوسروں کے ساتھ اس عنایت و عطیہ میں شریک ہوا کرتا ہے۔

''اب جب کہ تکریم کے معنیٰ اور تفضیل کے ساتھ اس کا فرق واضح ہوگیا تو یہ کہنا ہوگا کہ انسان کے اندر کچھ ایسی خصوصیت پائی جاتی ہے کہ دیگر مخلوقات عالم میں اس طرح کی خصوصیت نہیں پائی جاتی ہیں اور وہ نعمت عقل کی موجودگی ہے اور دیگر مخلوق سے انسان کی برتری و تفضیل کا مطلب یہ ہے کہ عقل کے علاوہ بھی دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں بعض خصوصیات و صفات میں اس کو برتری حاصل ہے اور انسان میں دیگر مخلوقات

---

[1] سورۂ اسراء، آیت: ۷۰

کی بہ نسبت پائی جانے والے خصوصیات وصفات کی میزان ومقدار ان سے کہیں زیادہ ہے"۔[1]

انسان کے اندر تجربہ وفکر کی صلاحیتوں کا وجود اس کی بے مثال اور حیرت انگیز خلقت کی دلیل ہے کہ جس پر اس کے حساب سے سپاس وشکر بجالانا چاہیئے کہ اسے اس طرح کی مخصوص نعمت عطا ہوئی ہے اور اسے صحیح طور پر حقیقی اور سچی معرفت، خلقت انسانی یعنی عبودیت وبندگی کی راہ پر لگانے کی ضرورت ہے۔ نیز اس کا انجام بھی قبول کرنے کے لئے تیار رہنے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلہ میں سورۂ ملک کی آیت نمبر تیئیس (۲۳) کا جائزہ لینا ضروری ہے:

﴿قُلْ هُوَ الَّذِیْ أَنشَأَکُمْ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِیْلاً مَّا تَشْکُرُوْنَ﴾

کہہ دو کہ وہ وہی ہے کہ جس نے تمہیں ہستی بخشی اور تمہارے لئے کان، آنکھیں اور دل کی ارزانی کی لیکن تمہاری شکرگذاری بڑی کم ہے۔

انشاء کا مطلب ہر چیز کے ایجاد کی ابتداء اور تربیت ہے اور یہ کہ آیت کے آخر میں اللہ نے عتاب کیا (کہ تمہاری شکرگذاری کم ہے) یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسانوں کے انشاء کا مقصد اسے ایسی حس وفکر سے آراستہ کرنا ہے جو خدا کی عظیم نعمتوں میں سے ایک شمار کی جاتی ہے کہ جس کا اندازہ واحصاء کسی بھی گرانقدر چیز سے نہیں کیا جاسکتا ہے۔

بشریت کے انشاء سے مراد صرف اس کی خلقت نہیں ہے بلکہ اس کی منفرد اور بے مثال خلقت وآفرینش بھی ہے یعنی یہاں تک کہ اس کی مثال مادہ میں بھی نہیں ملتی اور مادہ میں بھی انسان نام کی کسی چیز کا وجود نہیں تھا۔

...اور جملہ وَ جَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ، انسان کے حس وفکر کے

---

[1] ترجمہ تفسیر المیزان، ج:۱۳،ص:۲۱۵

وسائل وذرائع سے لیس ہونے کی طرف اشارہ ہے...

باوجوداس کے کہ انسان بہت سے اعلیٰ صفات منجملہ ظاہری وباطنی حواس پنجگانہ کا مالک ہوتے ہوئے دیگر مخلوقات سے افضل ہے لیکن آیت میں صرف سننے اور دیکھنے کی صفات کا ذکر ہوا ہے کہ جس کی دو وجہ اور دلیل ہوسکتی ہے کہ یا تو اس وجہ سے تھا کہ یہ دونوں دیگر خصوصیات سے زیادہ اہم ہیں یا دوسرا احتمال یہ ہے کہ ان دونوں سے مراد ظاہری صفات وحواس ہے... اور افئدہ جمع فواد بہ معنی قلب، انسان کا متفکر نفس ہے کہ جو اسے دیگر مخلوق سے برتر اور منفرد قرار دیتا ہے۔

"قَلِيلًا مَا تَشكُرُونَ" سے مراد ایسا شکر ہے کہ جس کو اس نعمت یا تمام الٰہی نعمتوں کے مطابق ہونا چاہیے"۔[1]

لیکن وہ شکر کہ جو نعمت حس وفکر کے لائق ومناسب ہے سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اسے شناخت کی صحیح راہ پر لگایا جائے اور اس سے صحیح فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو ضائع نہ کیا جائے۔ اس دانش وکوشش کا ماحصل اور ثمرہ امام حسین علیہ السلام کی اس روایت سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔

ایک دن حضرت حسین بن علی علیہ السلام نے اپنے اصحاب کے درمیان آکر فرمایا:

خداوند عالم نے مخلوقات کونہیں پیدا کیا مگر یہ کہ اس کو پہچانیں، کیوں کہ اگر اس کو پہچان لیں تو اس کی عبادت کریں گے اور جب اس کی عبادت کریں گے تو اس کی عبادت کے ذریعہ اس کے سوا کسی اور کی پرستش کی ضرورت نہ ہوگی۔[2]

آفاق وانفس کی آیتیں

پورا عالم وجود پروردگار عالم کی واضح وروشن آیتوں اور نشانیوں سے معمور ہے کہ اگر صحیح و صادقانہ معرفت حاصل ہوجائے تو ان آیتوں اور نشانیوں سے پروردگار کی عظمت کا ادراک

---

[1] المیزان، ج:۱۹، ص:۶۰۷ تا ۶۰۹

[2] علل الشرایع، باب ۹، ص:۹، بہ نقل از المیزان، ج:۱۸، ص:۵۸۶

ہو جائے گا اور ساتھ ہی کائنات کے بے مثال و بے ہمتا محبوب سے بندگی و دلدادگی کی حقیقت کا انکشاف عمل میں آسکتا ہے اور جو کچھ معرفت حاصل ہوتی ہے یا انسان کے اندر موجود ہے اسے خداوند عالم آیات انفسی کا خطاب دیتا ہے یا آفاق عالم میں جو کچھ پھیلا ہوا ہے اسے آفاقی آیات کا نام دیا گیا ہے۔

الٰہی معرفت کے حصول کی راہ میں آفاقی آیات اور نشانیوں کا مطالعہ نہایت اہمیت اور قدر و منزلت کا حامل ہے اور قرآن مجید نے بھی خلقت کے مظاہر پر غور و فکر کی بہت زیادہ تاکید و نصیحت فرمائی ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

''اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمَاوَاتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ اللَّیۡلِ وَالنَّھَارِ لَآیَاتٍ لِّاُوۡلِی الۡاَلۡبَابِ''۔[۱]

بتحقیق کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور شب و روز کے اختلاف و تفاوت میں صاحبان فکر کے لئے نشانیاں پائی جاتی ہیں۔

اس کے باوجود انفسی آیات اور اندرونی نشانیوں اور آثار کے اندر فائدے اور اس کی اہمیت بے شمار ہیں۔

حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا:

دونوں معرفتوں سے زیادہ بہتر، معرفت نفس ہے۔[۲]

ظاہری طور سے حضرتؑ کی ان دونوں معرفتوں سے مراد، ایک تو انفس پر مبنی آیات کی شناخت اور دوسری آفاقی آیتوں کا سمجھنا اور کشف کرنا ہے کہ جس کے بارے میں خداوند عالم نے فرمایا ہے:

---

۱ سورۂ آل عمران، آیت: ۱۹۰

۲ المیزان، ج: ۶، ص: ۲۵۰۔ بہ نقل از غرر الحکم خوانساری، ج: ۱، ص: ۲۹۷

''سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ.....''

ہم اپنی نشانیاں آفاق اور ہستی کے بیکراں کناروں تک نیز ان کے اندر تک بہت جلد دکھائیں گے تا کہ ان پر حق آشکار ہو جائے...

نیز یہ بھی فرمایا:

''وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ... وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ''[1]

زمین میں اہل یقین کے لئے نشانیاں ہیں اور تمہاری جانوں میں بھی نشانیاں اور آثار پائے جاتے ہیں، تو کیا تم انہیں نہیں دیکھتے ہو؟

لیکن یہ کہ ایسا کیا ہے کہ معرفت اورانفس کا مطالعہ آفاقی مطالعہ سے بہتر ہے، شاید اس وجہ سے ہو کہ زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ نفس کی معرفت اوصاف واعمال کی اصلاح سے حاصل ہوا کرتی ہے، لیکن آفاقی معرفت میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔[2]

انفسی مطالعہ سے کچھ ایسی آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ جس کے تحت موثر و مفید تعمیر نفس وجود میں آتی ہے:

''ذات نفس سے اطلاع، روح وجسم کے امکانات وتوانائی اور عوارض کی شناخت پر مبنی کچھ اعتدال پسندی وزیادتی نیز کچھ کاموں میں سستی وکاہلی اسی طرح انفسی مطالعہ کے دوران نیک و بد حالات وخصائل اور ملکات حاصل ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح کے امور سے آگاہی اس کے لوازمات پر آرام وآسائش وخطرات، سعادت وشقاوت اور درد وعلاج جیسے حالات وکوائف اندرونی آواز کو دل کے دروازے پر دستک دینے کا موجب ہوتے ہیں اور آدمی جب اپنے اندرونی درد اور اس کے علاج سے واقف

---

[1] سورۂ ذاریات، آیت:۲۱

[2] المیزان، ج:۶، ص:۲۵۱

ہو جائے گا تو جو کچھ برا اور فاسد ہے اس کے تدارک کی کوشش کرے گا اور صحیح کے حصول میں کوشاں ہوگا، حالاں کہ آفاقی مطالعہ اور نشانیوں کے سلسلہ میں ایسا نہیں ہے کہ اس کی آواز اور دھمک اتنے قریب سے آئے۔"

معرفت نفس کا موضوع

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان اپنے وجود کے تمام لمحات ولحظات میں "میں" یا "خود" کی حقیقت سے روبرو ہوتا ہے کہ اگر اس پر باریک بینی سے غور وخوض کرے تو اسے مادی محسوس سے الگ مشاہدہ کرے گا کہ "خود" ایک ایسی حقیقت ہے جس میں جسمانی تبدیلیوں کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے اور نہ ہی مقام اور زمانے اس پر اثر انداز ہوا کرتے ہیں۔ میں یا "خود" مادیات سے الگ ایک ایسی چیز ہے جس کے اجزا و اعضاء مادہ کے احکام میں مقید و پابند ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زیادہ تر وقت بلکہ اکثر اوقات اپنے بدن سے کہ جو اعضاء وجوارح والا ہے غفلت برتتا ہے اور پورے طور سے اپنے جسم کو بھول جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ اپنے سے بے خبر نہیں ہوتا ہے۔

"اگر کبھی کسی خاص حالت میں یہ کہتا بھی ہے کہ میں خود سے بے خبر ہو گیا یا خود سے غافل ہو گیا یا خود کو بھلا بیٹھا تو حقیقت میں یہ کلام مجازی ہوتا ہے کیوں کہ انہی تعبیرات کے دوران وہ یہ اقرار بھی کرتا ہے کہ اس غفلت وفراموشی کا عامل وباعث بھی "خود" ہی ہے لیکن نادانی کی بنا پر یہ کہنے کے بجائے کہ میں اپنے بدن اور اس کے درد سے غافل ہو گیا یا دوسری تعبیر استعمال کرے اُس بھول جانے کی نسبت کو اپنی جانب دیتا ہے اور کہتا ہے: "میں نے خود کو بھلا دیا"۔[1]

"بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ چوں کہ وہ ایک انسان ہے اس لئے اپنے سلسلہ

---

[1] المیزان، ج:۶، ص: ۲۶۴

میں اس طرح کا احساس اور فکر رکھنے پر مجبور ہے اور اگر اس بابت تھوڑی چاہت و الفت رکھتا ہے تو جسمانی محدودیتوں سے نکل کر گوناگوں مادی مقاصد کی طرف سے بے رغبتی کا اظہار کرتا ہے تو یقینی طور پر جیسا کہ بتایا گیا وہ خود کو ویسا دریافت کر سکتا ہے جیسا کہ وہ ہے اور یہ کہتا ہے کہ میرا یہ نفس "خود" مادہ یا مادیات سے کوئی برابری نہیں رکھتا ہے۔ کیوں کہ نفس کے خواص اور اثرات مادہ و مادیات کے خواص اور اثرات سے بالکل مماثلت و مطابقت نہیں رکھتے ہیں لیکن مع الاسف روزآنہ کی مصروفیات اور زندگی کے وسائل کی فراہمی کی تگ ودو، مادیات کے حصول اور جسمانی ضروریات کی فراہمی نے انسان کو مجبور کر دیا ہے کہ ان سب چیزوں کو بے فائدہ قرار دیتے ہوئے ان پر غور وفکر کرنا چھوڑ دے اور دن کے اجالے کی طرح واضح اس مطلب کو دھیان میں نہ لاتے ہوئے اپنے معمولی وعام اور اجمالی مشاہدے پر اکتفا کرے۔[1]

معرفت نفس کی جڑیں

اقوام ان کی راہ روش اور ان کے عقائد کے بارے میں جانچ پڑتال اور تحلیل وتجزیہ اور ان کے طرز سلوک و عمل کو دیکھنے اور آثار نفس اور اس کی معرفت کا پتہ لگانے کے بعد یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ اپنی عجیب وغریب خصلتوں اور خصوصیتوں کی وجہ سے سبھی اقوام عالم کے درمیان اختلاف اور فرق کے باوجود، رائج ومعمولی ہے یہاں تک کہ اس کو بہت ہی نازک وحساس اور گرانقدر شمار کیا جاتا ہے اور قدیم الایام سے ہی معرفت نفس کو بہت ہی گرانقدر شمار کیا گیا ہے۔

قدیم الایام سے انسانوں کے ذریعہ نفس کی جستجو اور تلاش کی ایک اہم وجہ یہ رہی ہے کہ تمام ادوار تاریخ میں دنیا کے دور دراز کے علاقوں یہاں تک کہ افریقہ وغیرہ میں بھی جادوگروں اور ساحروں کے آثار اب بھی باقی ہیں اور اس زمانے میں بھی ان کا وجود ہے اور ان میں ایسے لوگ بھی

---

[1] المیزان، ج:۲، ص:۲۶۵

ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ یہ اساطیری وافسانوی مسئلہ ایک حقیقت کی صورت میں اب بھی موجود ہے۔

''صرف تاریخ بشری نہیں بلکہ عقلی اعتبار سے اوران قدیمی مذاہب وفرق پر غوروفکر سے جو کہ ہماری دسترس میں ہیں یہ بات ثابت ہوتی ہے۔اس طرح کہ اگر ہم موجودہ اقوام وملل منجملہ برہمن، بودھ، ستارہ پرست، مانو، زرتشتی، مجوسی و یہودی، عیسائی اور اسلام کے بارے میں جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ نفس کی معرفت کے سلسلہ میں سب میں گہری جڑیں پائی جاتی ہیں کہ جن کے آثار کے حصول کے لئے کوششیں عمل میں آتی رہتی ہیں، حالانکہ یہ رجحان ورغبت اور حصول کا طریقہ ایک ہی نہیں بلکہ مختلف رہا ہے لیکن یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ سب نے ہی نفس کی پاکیزگی وروح کی تطہیر کی دعوت دی ہے''۔

ادیان کی مشترکہ وجوہات

انسان نفس کی تربیت کی خاطر اور بیرونی امور نیز مادی لذتوں سے دوری اور اپنے نفس کی توجہ کی خاطر جو کچھ اعمال انجام دیتا ہے یا نفس کے آثار اور ایسی طاقتوں کے حصول کے لئے کہ جنہیں فطری اسباب کے ذریعہ حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے وہ کوشش کرتا ہے، بہرحال ان سب میں اس کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہوا کرتا کہ وہ نفس کو بیرونی عوامل اور خارجی علل واسباب سے قطع کر کے بلاواسطہ طور پر بغیر کسی مدد کے ایسا کوئی کام انجام دے کہ وہ کام معمولی ومادی اسباب سے بھی انجام نہ پاتے ہوں۔

''بنابریں اپنے دین سے معتمد وایماندار آدمی اس طرح سے سوچتا ہے کہ آدمی کا ایک فریضہ یہ ہے کہ حقیقی سعادت کے حصول کی کوشش کرے جو کہ حیوانی خواہشات کی بے راہ روی سے حاصل نہیں ہوا کرتی ہے اس لئے وہ مجبور ہے کہ نفسانی خواہشات کو ترک کرتے ہوئے ایک یا کئی غیر مادی اسباب کا سہارا لے اور اس کی

اطاعت وپیروی کرتے ہوئے اس سے تقرب حاصل کرے۔''

''تسلیم وانکساری ایک روحی اور نفسی امر ہے کہ جس کو جسمانی اعمال اور پرہیز گاری و ریاضت کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے کہ جنہیں دین کے عبادی احکام کا نام دیا جاتا ہے جیسے نماز اور دیگر دینی آداب واعمال اور بہت سی دوسری چیزیں کہ جنہیں ایک لحاظ سے دینی آداب واعمال شمار کیا گیا ہے۔''

''ظاہر سی بات ہے کہ یہی سب دینی رسومات وعبادات اور مجاہدات وریاضات ایک طرح سے نفس سے مربوط ومتعلق ہیں کیوں کہ انسان فطری طور پر یہ احساس کرتا ہے کہ وہ کوئی بھی دینی واجب انجام نہیں دیتا اور کوئی بھی حرام ترک نہیں کرتا ہے مگر یہ کہ اس کے ذریعے اپنے نفس کی تربیت کرنا چاہتا ہے''...

''اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ سبھی مذاہب وادیان اپنی راہ وروش کے فرق کے ساتھ اجمالی طور پر تربیت نفس کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں رکھتے ہیں چاہے متدین لوگ ان ادیان کے بارے میں کوئی معلومات رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں۔''

ریاضت اور نفس کے حیرت انگیز آثار

ریاضت ومجاہدت کرنے والے حضرات چاہے وہ کسی دین کے گرویدہ وپیروکار نہ ہوں اور مجموعی طور پر یہ بات نہ جانتے ہوں کہ نفس کا وجود ہے یا نہیں ہے لیکن پھر بھی اس ریاضت و محنت کو کہ جس کا انہوں نے انتخاب کیا ہے انجام دیتے رہتے ہیں اور اس نتیجہ کے متوقع رہتے ہیں کہ جس کا انہیں وعدہ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی اور مقصد نہیں ہوتا ہے اور وہ نتیجہ بھی ان کے اعمال اور پرہیز گاری سے تعلق نہیں رکھتا ہے کیوں کہ اس نتیجہ اور پرہیز گاری پر مبنی اعمال کا کوئی فطری رابطہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک ارادی وغیر مادی رابطہ ہے جو ریاضت کش کے شعور وارادہ سے وابستہ ہے، پایا جاتا ہے اور یہ ایسا ارادہ اور شعور ہے جو نفس کے رابطہ اور نتیجہ کو بذریعۂ اعمال و

پرہیزگاری بحال و محفوظ رکھے ہوئے ہوتا ہے۔

اس لحاظ سے محنت کشی کی حقیقت، مطلوب نتیجہ تک رسائی حاصل کرنے کے لئے شعور و ارادہ کے سلسلہ میں نفس کی تکمیل و تائید ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ محنت کشی و ریاضت کا اثر یہ ہے کہ نفس سمجھ جائے کہ وہ مطلوب کو انجام دے سکتا ہے۔ جب محنت و ریاضت صحیح سمت و مقصدیت کے ہمراہ ہوگی تو ایسا ہوگا کہ نفس جب بھی مطلوب کا ارادہ کرے گا تو حاصل ہو جائے گا۔ اب چاہے مطلق طور پر ارادہ کرے یا خاص حالات و شرائط کے تحت اور اس کے لئے یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی چھوٹے بچے کے لئے اپنے سامنے آئینہ میں ظاہر کر سکتا ہے۔[1]

رسول اللہؐ کے حضور میں کچھ لوگوں نے بات اٹھائی کہ حضرت عیسیٰؑ کے کچھ صحابی پانی پر چلا کرتے تھے، آنحضرتؐ نے فرمایا: اگر ان کا یقین اس سے بھی زیادہ ہوتا تو فضاؤں میں بھی پرواز کر سکتے تھے۔[2]

”جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ روایت اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اس طرح کے امور کہ جو مافوق فطرت ہیں ان کا انحصار معمولی و مادی علل و اسباب کے اثرات کے عدم وجود اور خدائے سبحان پر یقین و اطمینان کے باعث ممکن و میسر ہے۔“

”لہٰذا خداوند عالم کی مطلقہ طاقت پر ایمان و اعتقاد (اور مادی اسباب و وسائل کے بے اثر ہونے کا علم) انسان کے اندر جتنا بھی بڑھتا جائے گا اسی قدر چیزیں اس کی مطیع و فرمانبردار ہوتی جائیں گی۔“

اس سلسلہ میں مکمل ترین اور جامع ترین کلام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا قول ہے جس میں امامؑ نے فرمایا:

---

[1] المیزان، ج:۶،ص:۲۷۲۔۲۷۳۔

[2] المیزان، ج:۶،ص:۲۷۴ از بحار الانوار، ج:۷۰،ص:۲۱۰ تا ۲۱۲ اور ص:۲۰۵۔

''جس جسم کے اندر قوی ارادہ ہوگا وہ کبھی کسی بھی عمل سے ناتواں نہ ہوگا''۔[1]

''اس لحاظ سے واضح ہوا کہ آثار، اعمال وعبادات، ریاضتیں اور مجاہدتیں اس ترتیب سے ہیں کہ نفس انسانی کا ان کے درمیان معنوی و باطنی رابطہ برقرار ہو چکا ہے اور حقیقت میں ان کا استعمال، مجاہدت وریاضت اور عبادتوں میں جس قدر زیادہ ہوگا، نفس کی تربیت بھی اسی حد تک زیادہ ہوگی۔''[2]

''اگر انسان کا ارادہ کامل ایمان اور مستحکم یقین کے ہمراہ ہو تو ایسا کام انجام دے سکتا ہے کہ جس کے انجام دینے سے عام انسان ناتواں ہوتے ہیں اور مادی ومعمولی اسباب انسان کو اس طرح کے نتائج تک نہیں پہنچا سکتے ہیں۔''

''...اس طرح کے امور کے لئے لوگوں کو ایسے نفس کی ضرورت ہے جو اپنے محدود، قید و بند اور جسمانی لذتوں سے رہائی حاصل کر کے تھوڑی دیر اپنی (برتری) کی جانب توجہ مبذول کر سکے۔ اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ نفس کی ریاضت ومجاہدت کی مختلف شکلوں اور بے شمار گوناگونی وفرق کا مشاہدہ کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ان سب میں نفس سے مقابلہ اور پراکندہ امور سے پرہیز بنیادی کام شمار ہوتا ہے کیوں کہ نفسانی خواہشات وشہوات کے رجحانات میں غرق ہونا نفس کے بارے میں مشغول ہونے سے روگرداں کر دیتا ہے اور''اپنے سے ہٹ کر دوسری خارجی چیزوں میں مشغول کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس اندرونی عظیم طاقت کو کہ جسے اپنی اصلاح و تربیت میں صرف ہونا چاہیئے ان خواہشات وتمایلات میں پراکندہ کر دیتا ہے اور اپنی

---

[1] المیزان ج:۶، ص:۲۷۴، از سفینۃ البحار، ج:۲، ص:۴۳۷۔

[2] المیزان، ج:۶، ص:۲۷۴۔

اصلاح سے روک دیتا ہے۔[۱]

معرفت نفس کی تلاش میں رہنے والوں کی قسمیں:

جو لوگ معرفت نفس حاصل کرنے میں مشغول ہیں وہ دو طرح کے ہیں:

۱۔ وہ لوگ ہیں جو نفس کے عجائبات اور اس کے آثار کو جو کہ مادی اسباب و مسببات کے دائرے سے خارج ہیں، حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے معیشت یا دیگر اغراض و مقاصد کے لئے کوئی راستہ تلاش کرنا چاہتے ہیں جیسے کہ طلسمات، تسخیر روح و کواکب و ستارہ، مؤکلین و جنات اور انسانی روح کا حاضر کرنا وغیرہ اسی طرح دعاء یا سحر وغیرہ یا اسی طرح جو لوگ جھاڑ پھونک اور گنڈہ تعویذ و عملیات سے سروکار رکھتے ہیں۔

۲۔ وہ لوگ ہیں جو خود اپنے نفس سے سروکار رکھتے ہیں اور مادی امور سے منہ پھیرتے ہوئے نفس سے الگ ہوکر اور نفس کی جستجو کر کے اسے پانے میں کوشاں ہوتے ہیں جیسا کہ تصوّف کے مختلف مذاہب کے لوگ کیا کرتے ہیں۔

۳۔ :وہ لوگ ہیں جو عرفان نفس کی تلاش و جستجو میں ہوتے ہیں، یہ اپنے لحاظ سے حقیقی عرفان والے لوگ ہیں کہ جن میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں:

کچھ لوگ تو صرف اس لئے اس راہ کو جاری رکھتے ہیں کہ اس طریقہ کو پسند کرتے ہیں۔ البتہ انہیں مختصر طور پر معرفت نفس کی آگاہی و واقفیت ہوا کرتی ہے، لیکن ان کی یہ معرفت کبھی بھی مکمل نہیں ہوتی ہے کیوں کہ ان کا مقصد نفس کے ماسوا کچھ اور نہیں ہوتا اس لئے وہ لوگ نفس کے خالق یعنی خداوند عالم سے جو کہ نفس کا حقیقی سبب ہے اور نفس کی زمام امور اور اس کے آثار اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں غافل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جیسی معرفت نفس ہونی چاہیۓ ویسی حاصل

---

[۱] المیزان، ج:۶، ص:۲۶۶

نہیں کر سکتے۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی کسی چیز کے بارے میں مکمل معرفت حاصل کرے جب کہ اس کی ہستی کی وجوہات خاص کر علت العلل (اصل واساس اور بنیاد) سے غافل رہے؟ کیا ایسا آدمی کسی ایسے شخص سے جو کسی میٹر یا چوکی یا آری کی معرفت وشناخت کا دعویٰ کرتا ہے لیکن وہ لکڑی کا سامان بنانے والے بڑھئی اور آری وغیرہ سے واقفیت نہ رکھتا ہو، فرق کرتا ہے؟ کیا یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ اس طرح کی معرفت کو جو کہ نفس کے اجنبی وانجان علم کے ہمراہ ہے، کہانت کا نام دیا جائے؟''

''لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جو معرفت نفس کے طریقہ کو اس لئے اور اس نظریے سے دیکھتے اور اپناتے ہیں کہ یہ ان کے پروردگار کی معرفت کا باعث ہے۔ یہ وہی طریقت وراستہ ہے کہ جس کی بابت دین نے لوگوں کو دعوت دی ہے اور پسندیدہ بھی قرار دیا ہے۔ انسان اپنی معرفت حاصل کرتا ہے کیوں کہ نفس خود کو پروردگار عالم کی بے شمار آیتوں اور نشانیوں میں سب سے بڑی آیت ونشانی سمجھتا ہے، الغرض یہ کہ نفس کو اپنے پروردگار تک رسائی کا ذریعہ اور وسیلہ تصور کرتے ہوئے اسے آخری منزل تصور کرتا ہے۔ ''وَاِنَّ اِلیٰ رَبِّکَ الرُّجعی'' یقینی طور پر بازگشت (واپسی) تمہارے پروردگار کی طرف ہی ہونی ہے۔[1]

فطرت عرفانی

''تصوف کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کی ایجاد مسلمانوں نے خود سے کی ہو یا اس کا تعلق صرف اسلام سے ہو کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مسلک ماقبل اسلام کے مذاہب منجملہ نصاریٰ اور دوسروں کے درمیان بھی پایا جاتا ہے، یہاں تک کہ بودھسٹوں اور بت پرستوں میں بھی ایسے ملتے ہیں کہ جنہوں نے اس راہ وروش کو اپنا رکھا تھا۔ بنابریں

---

[1] المیزان، ج:۶، ص:۲۸۱، ۲۸۲۔

اس طریقت کا وجود ما سلف میں بھی پایا جاتا تھا۔ البتہ ایسا نہیں تھا کہ انہوں نے اس کو ما سلف سے سیکھا اور خود کے اندر رائج کیا ہو یا اس کی کسی سے تقلید کی ہو۔ اس مدنیت کی مانند یا قومیت کی مانند جو کہ نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے حالانکہ کچھ قوموں اور گروہوں نے ایسا ہی تصور کیا ہے بلکہ ان معنوں میں کہ فطری دین لوگوں کو زہد کی دعوت دیتا ہے اور زہد بھی عرفان نفس کی راہنمائی کرتا ہے۔"[1]

خودشناسی کے سلسلہ میں خدائی فرمان

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾[2]

اے وہ لوگ جو ایمان لا چکے ہو اگر ہدایت پانا چاہتے ہو تم اپنے نفس پر توجہ مبذول کرو کیوں کہ جو لوگ گمراہ ہو چکے ہیں ان کی گمراہی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی ہے۔ (اور یہ یاد رکھو) تم سب کو اپنے رب کی جانب پلٹ کر جانا ہے لہٰذا جس چیز پر تم عمل کیا کرتے تھے ان سے تمہیں آگاہ کرائے گا۔

حالاں کہ آیت کا ظاہری مطلب واضح ہے اور مؤمنین کو حکم دیا گیا ہے کہ خود پر توجہ دیں اور اپنی راہ ہدایت کا خیال رکھیں اور گمراہوں کی گمراہی سے خائف نہ ہوں اور جان لیں کہ خداوند عالم سبھی لوگوں کا حاکم ہے اور سب کے لئے ان کے عمل کے مطابق حکم کرتا ہے لیکن بہر حال اس میں کچھ ظریف پہلو بھی پائے جاتے ہیں۔

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ"

کی عبارت میں "علیکم" اسم فعل ہے اور اس کا ترجمہ تمہارے لئے ہوگا اور "انفسکم" اس

---

[1] المیزان، ج:۶، ص:۲۸۔

[2] سورۂ مائدہ، آیت: ۱۰۵۔

کا مفعول ہے بنابریں خداوند عالم حکم فرماتا ہے کہ خود پر توجہ دو اور اپنے بارے میں غور وخوض کرو۔[1]

ہدایت وضلالت اور آخری مقصد

ضلالت وہدایت طریقت کے سلوک کے ذریعہ معرض وجود میں آتے ہیں وگرنہ اس کے علاوہ اور کوئی مطلب نہیں ہے کہ جس کسی کو اس بات کا خیال ہے کہ راہ کو ٹھیک سے طے کرنے کے لئے بیچ راستہ کا انتخاب کیا جانا چاہیے تو وہ اصلی مقصد تک مطمئن حالت میں پہنچ سکتا ہے اور وہ مرکزی نقطہ وہی نہائی مقصد ہے کہ جس تک رسائی پانا ہر سالک کا مقصود ومطلوب ہوا کرتا ہے۔ایسے آدمی کو ہدایت یافتہ کہا جاتا ہے اور اس کے برخلاف اگر اس نے اس سلسلہ میں سستی ولاپروائی سے کام لیا اور بیچ راستہ سے ہٹ کر ادھر ادھر بھٹک گیا تو بتدریج گمراہ ہوجائے گا اور مطلوب ومقصود نتیجہ سے محروم ہوجائے گا اور ایسے آدمی کو لوگ گمراہ کہتے ہیں۔

''لہٰذا آیۂ شریفہ نے انسانوں کے لئے راستہ اور ہدف مقرر کردیا ہے تاکہ سبھی اس مقصد کی جانب حرکت کرسکیں۔کچھ لوگ معینہ راہ سے اور مقصدیت سے بھٹکتے نہیں ہیں اور بڑی ہوشیاری برتتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کرلیتے ہیں اور کچھ لوگ راستہ سے بھٹک کر منحرف اور گمراہ ہوجاتے ہیں۔''

''اس میں کوئی شک نہیں کہ سبھی لوگوں کا مدنظر ہدف ومقصد، زندگی کی سعادت اور نیک انجام کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے لیکن بہر حال قرآن مجید کا فرمان ہے کہ انسان سعادت مند ہو یا گمراہ اسے خدا کی طرف ہی پلٹ کر جانا ہے۔''[2]

''اس بات کے لازمہ کے بعد یہ کہنا ہوگا کہ جو راستہ بھی سر کیا جاتا ہے چاہے وہ ہدایت

---

[1] المیزان، ج:۶،ص:۲۳۸۔

[2] المیزان، ج:۶،ص:۲۳۸، ۲۳۹۔

والا ہو یا غلط اور انحراف کا سبھی لوگوں کو خدا کی طرف ہی پلٹ کر جانا ہوگا۔"

کیوں کہ سرانجام اور مقصود کا نتیجہ و ماحصل اس کے اختیار میں ہے لیکن راستے مختلف ہیں، ایک راستہ آدمی کو اس کے مطلوب و مقصود اور فلاح و کامیابی تک پہنچاتا ہے اور دوسرا راستہ اس کے ماحصل نقصان پر مبنی ہے۔ بنابریں ان دونوں میں فرق خدا سے دوری اور نزدیکی پر ہے جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے:

﴿یَا أَیُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّکَ کَادِحٌ إِلَی رَبِّکَ کَدْحاً فَمُلَاقِیهِ﴾[1]

یعنی اے انسان! بے شک تو اپنے پروردگار کی جانب کوشاں ہے اور اس سے ملاقات کا شرف حاصل کرے گا۔ بنابریں جو لوگ ہدایت کی راہ کی جستجو میں ہیں وہ خداوند عالم کے رحم و کرم سے ملاقات کریں گے اور قریب سے اس کو بلائیں گے اور جو لوگ گمراہ ہوں گے وہ اس کے قریب نہیں پہنچ پائیں گے اور اس کی رحمت و محبت سے دور رہیں گے اور دور سے ہی خدا کو پکاریں گے "وَیُنَادَوْنَ مِن مَّکَانٍ بَعِیدٍ" اور خداوند عالم بھی ان کی طرف نہیں دیکھے گا "وَلَا یَنظُرُ إِلَیْهِمْ"

اور خدا یہ بھی فرماتا ہے:

﴿أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾[2]

جان لو کہ اللہ کے لشکر والے کامیاب ہونے والے ہیں۔

یعنی جو لوگ کہ اس کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں وہ پردوں اور رکاوٹوں کو ہٹاتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچ جایا کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَی الَّذِینَ بَدَّلُوا نِعْمَةَ اللَّهِ کُفْراً وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ﴾[3]

---

[1] سورۂ انشقاق، آیت:۶۔

[2] سورۂ مجادلہ، آیت:۲۲۔

[3] سورۂ ابراہیم، آیت:۲۷۔

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ جنہوں نے خدا کی نعمت کے شکرانے کے بجائے کفر اختیار کر لیا اور اپنی قوم کو ہلاکت میں ڈال دیا بنا بریں اگر کوئی اپنا خیال نہ رکھے تو اس کے گمراہ اطرافی اسے منزل مقصود سے دور کر دیتے ہیں۔

اور وہ خدا یہ بھی فرماتا ہے:

﴿فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ﴾[1]

پس میں اپنے بندوں کے قریب ہوں اور دعا کرنے والوں کی دعوت کو قبول کرنے والا ہوں جب وہ مجھے بلائیں گے۔ بنا بریں ضروری ہے کہ وہ بھی ہماری دعوت کو قبول کرنے والے بنیں اور ایمان لائیں اس بات پر کہ وہ رشد و سعادت کی منزل پر فائز ہوں گے۔

نیز اس نے یہ بھی فرمایا ہے:

﴿وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى أُولَٰئِكَ يُنَادَوْنَ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ﴾[2]

یعنی جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کان نہیں سنتے ہیں اور قرآن ان کے لئے نابینائی لاتا ہے گویا یہ ایسے لوگ ہیں جن کو دور سے آواز لگائی جا رہی ہے۔

کیوں کہ یہ لوگ منزل مقصود اور اس کے راستہ سے قریب نہیں ہوئے ہیں۔

''خداوند عالم ان آیتوں کے ذریعہ اعلان کرتا ہے کہ سبھی راستہ طے کرنے والے خواہ نخواہ جانب خدا قدم اٹھایا کرتے ہیں لیکن ان میں سے کچھ کے راستے مختصر ہوتے ہیں اور ان کی ترقی و کامیابی قطعی ہوتی ہے تاہم کچھ کی راہیں طولانی ہوتی ہیں اور سعادت

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت: ۱۸۶۔

[2] سورۂ فصلت، آیت: ۴۴۔

تک نہیں پہنچتیں، بلکہ ہلاک ہوجایا کرتے ہیں۔''[1]

''اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مقدس کلام اللہ لوگوں کو اپنی گم شدہ راہ کی جانب ہدایت کرتا ہے یعنی حکم فطرت کے مطابق جس ثواب یا سعادت کی جستجو میں ہوتے ہیں وہ پالیتے ہیں اور سرانجام اسے نیک قرار دیتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ تمہارا گمشدہ (سرمایۂ ہدایت) تمہارے پروردگار کے پاس ہے، جو کوئی اس کی درگاہ کی جانب حرکت کرے گا وہی اس کو پائے گا اور جو کوئی گمراہ ہوگا وہ اس سے محروم ہوگا۔''[2]

مؤمن کا نفس صراط مستقیم ہے

''علیکم انفسکم'' کے جملہ سے کہ جس میں مؤمنین کو اپنے نفس کا خیال رکھنے کا حکم دیتا ہے بخوبی یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ جس راہ پر چلنے کا حکم دیا ہے وہ نفس مؤمن ہے کیوں کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ دیکھو ہرگز اپنے راستہ سے مت بھٹکنا، اس کا مطلب خود راستہ کی نگہداشت ہے نہ کہ راہیوں کی معیت سے الگ ہونا ہے، بنابریں یہاں پر جو ارشاد ہوا ہے کہ، خبردار رہو اور اپنے نفسوں پر توجہ دو، اس سے پتہ چلتا ہے کہ نفوس وہی راستے ہیں نہ کہ ان پر چلنے والے! جیسا کہ اس کی مثال ہمیں اس آیت میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

﴿وَأَنَّ هَـٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيماً فَاتَّبِعُوهُ وَلاَ تَتَّبِعُواْ السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ﴾[3]

یعنی یقینی طور پر میری یہ راہ ہموار اور سیدھی ہے لہٰذا اس کی پیروی کرو اور متفرق راستوں پر نہ چلو۔

---

[1] المیزان، ج:٦،ص:۲۳۹، ۲۴۰۔

[2] المیزان، ج:٦،ص:۲۳۹۔

[3] سورۂ انعام، آیت: ۱۵۳۔

''بنابریں اگر یہ فرمایا: اپنے نفس کا خیال رکھو تو مقصد یہ ہے کہ اس کا تحفظ کرو کیوں کہ خود تمہارا نفس تمہارے لئے راہ ہدایت ہے اور یہ اس لئے نہیں ہے کہ تمہارا نفس راہ ہدایت پر چلنے والوں میں سے ایک ہے (اس لئے خیال رکھو کہ تمہارا نفس جادۂ اصلی سے بھٹک نہ جائے بلکہ تمہارا نفس تو بذات خود راستہ ہے اور اپنی پہچان کر کے معرفت خدا کی راہ میں حائل پردوں کو تدریجی طور پر ہٹا کر خدا کی اصل معرفت کو پا سکتے ہو جو کہ اس کا اصل مقصد ہے اور سب کی بازگشت اسی کی جانب ہے) دوسرے لفظوں میں یہ کہ خداوند عالم مؤمنین کو راہ ہدایت کی حفاظت کی خاطر ان کے نفس پر دھیان رکھنے کا حکم دیتا ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نفس مؤمن وہی راستہ ہے کہ جس پر اس کو چلنا چاہیئے۔ بنابریں مؤمن کا نفس وہی راستہ اور طریقت ہے جو خداوند عالم تک پہنچتا ہے۔ مؤمن کا نفس اس کا ایسا راستہ ہے جو اسے سعادت کی راہ تک پہنچاتا ہے۔''

زیر بحث آیت نے بات کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے اور مندرجہ ذیل آیتوں نے اجمالی طور پر اس پر روشنی ڈالی ہے:

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللهَ إِنَّ اللهَ خَبِیرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ وَلَا تَکُونُوا کَالَّذِینَ نَسُوا اللهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ أُولَئِکَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾[1]

یعنی اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے اللہ کے لئے تقویٰ اختیار کرو اور جو کچھ تم بھیج چکے ہو اس کا انتظار کرو اور خدا سے ڈرو کیوں کہ جو تم عمل کرتے ہو خداوند عالم اس سے آگاہی رکھتا ہے اور ایسے لوگوں کی طرح نہ بنو کہ جنہوں نے خدا کو بھلا دیا اور خدا نے بھی انہیں بھلا دیا کیوں کہ وہ لوگ فاسق ہیں۔

---

[1] سورہ حشر، آیت: ۱۹، ۲۰۔

اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ اپنے نفس پر توجہ دی جائے اور اپنے صالح اور نیک اعمال کا جو کہ کل کے لئے سامان سفر ہے (اور بہترین سامان سفر تقویٰ ہے) خیال رکھیں کیوں کہ آج کے نفس کے لئے کل بھی پایا جاتا ہے اور نفس بھی ہر لحہ اور ہر گھڑی حالت سفر میں ہے اور اس راہ وسفر کا اختتام بھی خدا تک پہنچنا ہے اس لئے آدمی کے لئے ضروری ہے کہ اس راہ کو جاری رکھے اور ہمیشہ خدا کو یاد کرتا رہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے غافل نہ رہے۔

خداوند عالم مقصد وہدف ہے اور عقلمند و ہوشیار آدمی اپنے مقصد کو بھلایا نہیں کرتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ مقصد کو بھلانے کا مطلب راستہ کا فراموش کرنا ہے۔

اس بنا پر اگر کوئی اپنے خدا کو بھلا بیٹھتا ہے تو گویا اس نے خود کو بھلا دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو زاد سفر اور زندگی کا سرمایہ ہے وہ اس نے اکٹھا نہیں کیا اور یہ اسی ہلاکت کے مترادف ہے۔

ہلاکت یعنی اپنی ہستی کو جلا کر راکھ کر دینا اور جو کوئی خود سے غافل ہوگا گویا اس نے خود کو تباہ و برباد کر دیا۔

معرفت نفس کے سلسلہ میں روایتیں

ایک روایت کے تحت کہ جسے شیعہ اور سنی دونوں نے ہی نقل کیا ہے۔

رسول خدا فرمایا:

''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ''۔[1]

جس نے خود کو پہچان لیا گویا اس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا۔

یہ ایسا پہلو ہے کہ جس میں کافی غور وخوض اور فکر وتامل کی ضرورت ہے اور یہی اس بات

---

[1] غرر الحکم خوانساری، ج:۵، ص: ۱۹۴

کو ثابت کرتا ہے کہ اس کے اندر بہت سے نصائح پوشیدہ ہیں''۔[1]

''بعض علماء نے کہا ہے کہ اس حدیث نے معرفت نفس کو تعلیق محال قرار دیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ نفس کی شناخت محالات میں سے ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات غلط ہے کیوں کہ سب سے پہلے تو یہ کہ ایک دوسری روایت میں ہے کہ'' اَعْرَفُکُمْ بِنَفْسِهٖ اَعْرَفُکُمْ بِرَبِّهٖ ''تم میں سب سے زیادہ شناخت رکھنے والا، خدا کو بہتر طور پر پہچاننے والا ہوتا ہے (اس روایت سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ معرفت نفس کا امکان پایا جاتا ہے۔)

دوسرے یہ کہ مذکورہ حدیث حقیقت میں اس آیۂ شریفہ کی نقیض کے برخلاف ہے:

﴿وَلَاتَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ﴾[2]

امیر المؤمنین علیہ السلام سے روایت منقول ہوئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

سب سے بڑی جہالت انسان کی اپنے نفس سے متعلق جہالت ہے۔[3]

حضرتؑ نے اسی طرح فرمایا:

جو شخص خود کو زیادہ پہچانے گا وہ خدا کو زیادہ خاطر میں رکھے گا۔[4]

آخری حدیث کی وضاحت میں علامہ فرماتے ہیں:

''وجہ یہ ہے کہ ایسا آدمی اپنے خدا کے سلسلہ میں زیادہ عالم وآگاہ اور عارف ہے۔

جیسا کہ خداوند عالم نے فرمایا ہے:

''اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ''

---

[1] المیزان، ج:۶،ص:۲۴۴۔

[2] سورۂ حشرہ، آیت:۱۹۔المیزان، ج:۶،ص:۲۵۰۔

[3] غرر الحکم، ج:۲،ص:۸۸ تا ۱۹۸ از ج:۶،ص:۲۵۵۔

[4] غرر الحکم، ج:۲،ص:۸۸۔

یعنی بندوں میں صرف علماء ہیں جو خوف خدا رکھتے ہیں''۔[۱]

آپؑ نے یہ بھی فرمایا:

میں اس آدمی سے حیران ہوں کہ جو اپنی گمشدہ چیز کے لئے تو آواز لگاتا رہتا ہے اور اِن سے اُن سے پوچھتا رہتا ہے جب کہ اس نے خود کو گم کرلیا ہوتا ہے اور اپنے آپ کی تلاش میں نہیں رہتا ہے۔[۲]

آپؑ نے یہ بھی فرمایا:

انسان کی سب سے اچھی سوچ اس کی خود کی شناخت و معرفت ہے بنابریں جس نے خود کو پہچانا اس نے خردمندی کو اپنا لیا اور جو کوئی اپنے نفس سے نادان رہ گیا وہ گمراہ ہو گیا۔[۳]

آپؑ نے یہ بھی فرمایا:

آدمی کی معرفت کے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ خود کو پہچان لے اور اس کی نادانی کے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ خود کو نہ پہچانے۔[۴]

آپؑ نے یہ بھی فرمایا:

جو کوئی خود کو پہچانے گا وہ دوسروں کو بہتر طور پر پہچان سکتا ہے اور جو کوئی اپنے نفس سے ناواقف ہوگا وہ دوسروں کی نسبت زیادہ جاہل و ناواقف ہوگا۔[۵]

اور آپؑ نے یہ بھی فرمایا:

---

۱ المیزان، ج:۶، ص:۲۵۵۔

۲ غرر الحکم، ج:۲، ص:۴۴۲ از ج:۶، ص:۲۵۵۔

۳ غرر الحکم، ج:۲، ص:۴۴۲ از ج:۶، ص:۲۵۵۔

۴ غرر الحکم، ج:۴، ص:۵۷۵ از المیزان، ج:۶، ص:۲۵۶۔

۵ غرر الحکم، ج:۵، ص:۴۰۵ از ج:۶، ص:۲۵۶۔

جو شخص بھی اپنے آپ کو پہچانے گو یا وہ ہر علم و معرفت کی تہہ تک پہنچ گیا۔[۱]

آپؑ نے یہ بھی فرمایا:

معرفت نفس سب سے زیادہ نفع بخش معرفت ہے۔[۲]

حضرتؑ نے مزید فرمایا:

اپنے نفس سے ناواقف نہ رہو کیوں کہ جو کوئی اپنے نفس سے ناواقف رہ جائے وہ حقیقت میں ہر چیز سے جاہل رہے گا۔[۳]

ضروری اور ہمہ جانبہ راستہ

''دیگر مخلوقات کی مانند انسان بھی الٰہی تربیت کے تحت قرار پاتا ہے، جب کہ کوئی بھی امر پروردگار کی نظروں سے پنہاں نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن مجید نے فرمایا ہے:

﴿مَامِن دَآبَةٍ إلاَّهُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا إِنَّ رَبِّي عَلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾[۴]

کوئی بھی ایسا متحرک نہیں کہ جس کی ہر حرکت پر اس کی نظر نہ ہو اور میرا پروردگار راہ راست پر ہے۔

یہ تکوینی تربیت ہے اور سبھی مخلوقات عالم کو جو کہ خدا کے راستہ پر رواں دواں ہیں، شامل ہے۔

اور فرمایا ﴿أَلآ إِلَى اللهِ تَصِيرُ الأُمُورُ﴾[۵]

---

۱ غرر الحکم، ج:۵،ص:۴۲۶، از ج:۲،ص:۲۵۶۔

۲ غرر الحکم، ج:۱،ص:۱۷۹ از ج:۲،ص:۲۵۶۔

۳ غرر الحکم، ج:۶،ص:۳۰۶، از ج:۶،ص:۲۵۶۔

۴ سورۂ ہود، آیت:۵۶۔

۵ سورۂ شوریٰ، آیت:۵۳۔

جان لو کہ تمام امور کی بازگشت خدا کی طرف ہے۔

''یہ تربیت کسی بھی مخلوق کے درمیان کسی دوسری مخلوق کی بہ نسبت فرق نہیں رکھتی کیوں کہ صراط مستقیم اور ہماہنگ فرمان کائنات کی سبھی مخلوق کو شامل ہے۔

﴿مَاتَرَیٰ فِی خَلقِ الرَّحمٰنِ مِن تَفَاوُتٍ﴾[1]

''خدائے مہربان کی تخلیق میں کسی بھی فرق کا مشاہدہ نہیں کروگے''۔[2]

دوسروں کی طرح انسان کو بھی اسی راستہ پر قرار دیا گیا ہے کہ جسے اس راہ پر چلنا ضروری ہے۔

''انسان کا اپنے پروردگار کی جانب راستہ اس کا نفس ہے اور خداوند عالم اس کے سفر اور مقصد کا مرکز و منزل حقیقی ہے۔''

اور یہ طے کیا جانے والا یہ راستہ دیگر راستوں کی مانند اختیاری نہیں ہے اور اصولی طور پر اس راستہ کے لئے کوئی دوسری مثال نہیں پائی جاتی ہے کہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کیا جا سکے:

﴿یَا اَیُّهَا الْاِنسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلَی رَبِّکَ کَدحاً فَمُلَاقِیهِ﴾[3]

اے انسان بتحقیق کہ تو اپنے پروردگار کی جانب رواں دواں ہے اور بہت جلد اس سے ملاقات کرے گا۔

اس آیۂ شریفہ سے یہ مستفاد ہوتا ہے طریقت اور راہ نفس وہ ضروری راستہ ہے کہ اس پر چلنے کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے، یہ ایسا راستہ ہے کہ جس پر مؤمن و کافر، آگاہ و غافل اور مختصر یہ کہ سب کو ہی چلنا پڑتا ہے۔

---

[1] سورۂ ملک، آیت: ۴۔

[2] المیزان، ج:۶، ص: ۲۴۵۔

[3] سورۂ انشقاق، آیت: ۶۔

''حقیقت میں یہ مذکورہ آیت لوگوں کو اس بات کی تاکید ونصیحت نہیں کرتی ہے کہ اس راہ پر چلنے سے گریز نہ کریں بلکہ اس حقیقت کی یاددہانی کراتی ہے کہ جس سے وہ غافل و انجان ہیں۔''[1]

مجموعی طور پر اس آیت کا ماحصل یہ ہے کہ انسان اور دیگر مخلوقات عالم سب کے ہستی کے ذریعہ خدائے واحد و یکتا کی جانب مجذوب ومبذول ہو کر کھنچی چلے جاتے ہیں اور اس دنیا میں اٹھایا جانے والا ہر قدم اور ہر لحہ اس کی جانب اور اسی کے لئے ہوتا ہے۔

عمل میں معرفت نفس کی تاثیر

''انسان انفسی آیات اور نشانیوں کی راہ میں کوئی بھی قدم نہیں اٹھاتا اور کوئی تاریک یا روشن راہ پر نہیں چلتا مگر یہ کہ ان سب کا قلبی امور اور اعتقادات نیز صالح وغیر صالح جسمانی اعمال سے ایسا رابطہ ہے کہ خواہ نخواہ اچھا یا برا اثر پڑتا ہے جو کہ اس کے لئے زاد راہ اور سرمایہ ہوتا ہے۔''[2]

خداوند عالم نے انسان کے انجام کار یعنی سعادت وشقات کو نفس کے حالات کی بنیاد پر منحصر جانا ہے جو کہ وہ حالات بھی ان اعمال پر مبنی ہوتے ہیں جو کہ صالح وطالح اور تقویٰ وفجور پر تقسیم ہوتے ہیں اور نفس کی تعریف اس طرح کی ہے:

﴿وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا﴾[3]

قسم ہے نفس کی اور اس کی جس نے اسے ہماہنگ وموزوں خلق کیا اور پرہیز گاری و

---

[1] المیزان، ج:۶، ص:۲۴۴، ۲۴۵۔

[2] المیزان، ج:۶، ص:۲۴۴۔

[3] سورۂ شمس، آیت:۷ تا ۱۰۔

عصیان گری (نافرمانی) کو الہام بخشا اور اسے نمایاں کیا، لہٰذا بتحقیق وہی کامیاب ہوا کہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور نقصان اس نے اٹھایا اور گھاٹے میں وہ رہا کہ جس نے خود کو نہیں پہنچانا اور دھوکہ کھایا۔[1]

انسان کی کتاب نفس میں الٰہی الہام کے ذریعہ اس کے نیک و بد اعمال مشخص کردیئے گئے ہیں:

نفس پر توجہ دینے سے صالح اعمال انجام پاتے ہیں، برائیاں ترک ہوتی ہیں اچھے اور نیک قلبی و معنوی حالات، سعادت (خدا سے قربت اور اس سے ملاقات) کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور ایسے نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

خود سے غافل ہونے کے نتیجہ میں برے اعمال انجام پاتے ہیں، نفسانی خواہشات غلط راستوں پر مہمیز کرتی ہیں اور دل میں تاریکی و شقاوت گھر کرتی ہے جس کی وجہ سے خدا سے دوری آتی ہے اور حق تعالیٰ کی بہ نسبت بیوقوفی و اندھاپن وجود میں آتا ہے۔

نفس کا راستہ پر چلنا ایک تبدیل نہ ہونے والی حقیقت ہے جو کہ ثابت و استوار ہے اور انسان کا علم و جہل اس کے ہونے یا نہ ہونے میں دخالت نہیں رکھتا ہے البتہ خود سے غفلت یا عدم غفلت کا اثر اعمال پر پڑتا ہے اور یہ امر راستہ طے کرنے کی کیفیت کو معین کرتا ہے حالاں کہ اس کا طے کرنا ضروری اور اس سے گریز بھی ممکن نہیں ہے۔

سعادت و شقاوت میں معرفت نفس کی تاثیر

نفس کے جبریہ اور ناقابل گریز راستہ اور سفر کے دوران انسان کا جسم جو کہ نفس کا ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے یا انسانی وجود کا پست اور مادی درجہ ہے، وجود میں آتا ہے اور رشد و ترقی حاصل کرتا ہے، پیدا ہوتا ہے، وجود میں آتا ہے، بچپن جوانی اور بڑھاپے کی منزلیں طے کرتا ہے اور

---

[1] المیزان، ج:۶، ص:۲۴۶۔

آخرالامر مٹی میں سما کر معدوم ہو جاتا ہے۔ جسم کے ساتھ روح بھی وجود میں آتی ہے اور ہر دم اپنے پروردگار سے فیض وجود بھی حاصل کرتی ہے۔ اس طرح سے اپنی ہستی اور حیات کو جاری رکھتی ہے۔

اب یہ انسان پر ہے کہ اپنے ارادہ وعمل اور نیت وفکر کے ذریعہ اس روح کو ترقی بخشے اور خود کو رضائے الٰہی تک پہنچا دے یا اپنے نفس کو اس قدر گرا دے کہ خدا کی بنائی ہوئی دوزخ کا مستحق قرار پا جائے۔

بنابریں راستہ وہی نفس کا ہے کہ اگر یہ جنت کی جانب گیا تو صراط مستقیم ہے اور اگر دوزخ کی طرف گیا تو دائمی عذاب اس کا مقدر ہوگا۔

''جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں کہ یہ آیتیں ایسی راہ کا تعین کرتی ہیں کہ جس کا ایک سرا تو معتدل اور سادہ نفس اور دوسرا سرا کامیابی یا محرومی کی جانب جاتا ہے۔ اس وقت یہ دو نتیجے یعنی کامیابی یا محرومیت کو تزکیۂ نفس اور اس کے آلودہ وآغشتہ ہونے پر محمول کیا جاسکتا ہے (اور معلوم ہے کہ اس نفس کی پاکیزگی یا آغشتہ ہونے کا ربط اخلاق سے ہے) اس کے بعد فضیلت ورذالت اور تقویٰ وفجور یعنی نیک اور برے عمل پر محمول کیا گیا ہے جب کہ مذکورہ آیتیں اچھائی اور برائی کو فطرت سے مربوط جانتی ہیں اور اس فطرت کو خداوند عالم کی جانب سے انسانوں کو بصورت الہام عطا کیا گیا ہے۔''[1]

انسان فطری طور پر اچھائی کو اچھائی اور برائی کو اس کی نیک وبد اوصاف کے عنوان سے پہنچانتا ہے اور اس پہچان کے ساتھ شناخت کرنا بھی جانتا ہے اور نور فطرت نیز اپنے نفس کی شناخت کے سبب قرب حق کے ذریعہ ارتقاء کی منزل کو بھی پا سکتا ہے اور اسی طرح اپنی غفلت ونادانی اور معصیت کی بنا پر اپنے راستہ کو ٹیڑھا کرتے ہوئے نفس کے اندھیروں میں گم ہو کر اور گمراہ ہو کر اپنے مہربان خدا کے حضور تک نہ پہنچ سکے اور اس کی رحمت سے دور ومحروم ہو جائے جیسا کہ

---

[1] المیزان، ج:۶، ص:۲۴۶۔

خداوند عالم نے فرمایا ہے:

''لَا یَنظُرُ اِلَیھِمْ وَ لَا یُکَلِّمُ مَعَھُمْ''۔

''یعنی خداوند عالم گمراہوں کی طرف نہیں دیکھتا اور ان سے کلام بھی نہیں کرتا''

اور غافل لوگوں کے بارے میں فرمایا:

﴿یُنَادَوْنَ مِنْ مَکَانٍ بَعِیدٍ﴾[1]

''وہ (گمراہ) لوگ دور سے خدا کو پکارتے ہیں''۔

''اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو لوگ اپنی اور خدا کی یاد میں رہتے ہیں وہ ان لوگوں کے مقابلہ میں جو غافل ہیں اور حقائق کو جو کہ ایک لمحہ کے لئے بھی ان سے الگ نہیں ہے، سمجھتے نہیں ہیں ایک جیسے نہیں ہوں گے۔

جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے:

﴿هَلْ یَسْتَوِی الَّذِینَ یَعْلَمُونَ وَ الَّذِینَ لَا یَعْلَمُونَ إِنَّمَا یَتَذَکَّرُ أُوْلُوا الْأَلْبَابِ﴾[2]

کیا جو لوگ جانتے ہیں اور جو لوگ نہیں جانتے ہیں یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ صاحبان خرد اور عقل مند لوگ ہی یاد دہانی کرانے والے ہوتے ہیں''

نیز یہ بھی فرمایا:

﴿فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَ لَا یَشْقَی وَ مَنْ أَعْرَضَ عَن ذِکْرِی فَإِنَّ لَهُ مَعِیشَةً ضَنکاً وَ نَحْشُرُهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ أَعْمَی قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِی أَعْمَی وَ قَدْ کُنتُ

---

[1] سورۂ سجدہ، آیت: ۴۴۔

[2] سورۂ زمر، آیت: ۹۔

بَصِیراً قَالَ کَذٰلِکَ أَتَتْکَ آیَاتُنَا فَنَسِیتَهَا وَ کَذٰلِکَ الْیَوْمَ تُنسَیٰ﴾[1]

یعنی جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ کبھی گمراہ اور بدنصیب نہ ہوگا اور جو کوئی مجھ سے منہ پھیرے گا اس کی روزی ورزق میں پریشانی آئے گی اور بروز قیامت اندھا محشور ہوگا تب پھر اپنے پروردگار سے کہے گا کہ مجھے اندھا کیوں محشور کیا جب کہ میں دیکھ سکتا تھا تو خدا کہے گا: جس طرح کہ ہماری آیتیں تم تک پہنچیں اور تم نے بھلا دیا، ویسے ہی آج تم بھلا دیئے جاؤ گے۔[2]

معرفت نفس اور خلوص

امام علی علیہ السلام سے نقل کیا گیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"چالاک وہ ہے جو خود کو پہچانے اور اپنے اعمال کو خالص کرے"۔[3]

نفس کی معرفت اور اخلاص کے درمیان رابطہ اس طرح سے ہے کہ انسان اپنی غربت و تنگدستی، ضروریات اور ذلت کے بارے میں شناخت رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی خدا سے وابستگی کے رابطے اور اس کی عظمت وجلالت کو پہچانتا ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کو جان و دل سے نکال پھینکتا ہے اور خلوص کی جانب قدم بڑھاتا ہے۔

اس سلسلہ میں علامہ فرماتے ہیں:

اس حقیقت کو یاد رکھنے والا بندہ (جو اپنے نفس کی راہ پر حرکت میں سرگرم ہوتا ہے) ہر لحہ اس کی یاد میں رہتا ہے اور متوجہ ہوتا ہے کہ اپنے خدا کی نسبت کیا مقام و مرتبہ رکھتا ہے اور اس کی نسبت دیگر اجزائے عالم میں کیا حیثیت و نسبت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے نفس کو

---

[1] سورۂ طٰہٰ، آیت: ۱۲۶۔

[2] المیزان، ج: ۶، ص: ۲۴۶۔

[3] غرر الحکم خوانساری بہ نقل از المیزان، ج: ۶، ص: ۲۵۔

دیکھتا ہے اور متوجہ ہوتا ہے کہ اس کا نفس غیر خدا سے منقطع ہو چکا ہے جب کہ عدم توجہ رکھنے والا یہ سب باتیں نہیں سوچ پاتا ہے اور یہی یاد رکھنے والا اپنے نفس پر توجہ دینے سے قبل خود کو دنیا سے متعلق و مرتبط قرار دیتا ہے نہ کہ اپنے پروردگار سے۔[1]

جب انسان کا نفس اپنے پروردگار کی جانب حق کے راستہ اور قطعی مقصود سے آگاہ و بیدار ہو جائے اور غیر خدا سے علیحدہ ہو جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اس کے لئے خالص اور مطلق طور پر عمل کرے گا اور خالص عمل اس کے نفس کے مقام میں اضافے اور حق سے زیادہ قریب ہونے کا موجب ہوگا جیسا کہ ارشاد ہو رہا ہے:

﴿وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ﴾[2]

صالح عمل نفس کی پاکیزگی کے معیار کو بلند کرتا ہے، اصل راستہ اور مقصدیت پر توجہ و یاددہانی اور اس سے عدم غفلت کے ذریعے انسانی سعادت کو رقم کرتا ہے اور باوجود اس کے کہ "اس راہ و مقصد کے سلسلہ میں اس کے ہونے یا نہ ہونے میں انسانی زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا لیکن ان کے عمل میں توجہ رکھنا بھی بے اثر نہیں ہوتا اور ظاہر ہے کہ انسانوں کا واحد مربی اس کا عمل ہے، یہ عمل ہے جو نفس کو پروان چڑھاتا ہے۔ اگر یہ عمل واقع اور حقیقت ہستی سے کہ جس کی وجہ سے تخلیق عمل میں آئی ہے، مطابقت اور سازگاری کا مصداق قرار پائے تو وہ نفس کہ جسے اس طرح کے عمل سے کمال حاصل کرنا چاہیئے۔ نیک اور کامیاب نفس قرار پائے گا۔[3]

گنہ گاروں پر توجہ سے پرہیز

"عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ" یہ آیت مؤمنوں کو حکم دیتی ہے کہ خود کو دیکھیں اور دوسروں سے

---

[1] المیزان، ج:۶، ص:۳۴۷۔

[2] سورۂ فاطر، آیت:۱۰۔

[3] المیزان، ج:۶، ص:۲۴۵

جو کہ گمراہی میں مبتلا ہیں پرہیز کریں اور ان کی صف میں قرار نہ پائیں اور اسی کے ساتھ ان سے ڈریں بھی نہیں اور یہ جان لیں کہ گنہگاروں کا مؤاخذہ خدا کرے گا مؤمنین کا یہ حق نہیں ہے اور مؤمنین ان کے کاموں کے ذمہ دار نہیں ہیں کہ بیٹھ کر سوچیں اور ان کی گمراہی وضلالت کے بارے میں غور وفکر کرتے پھریں۔

بنابریں مذکورہ آیت مضمون کے لحاظ سے اس آیت کے قریب ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

''قُلْ لِلَّذِيْنَ آمَنُوا يَغْفِرُو الِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللهِ لِيَجْزِيَ قَوْماً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُوْنَ''

اے میرے رسول! ایمان لانے والوں سے کہہ دیجئے کہ وہ ان لوگوں کی فکر نہ کریں کہ جو روز قیامت سے امید نہیں رکھتے ہیں بلکہ یہ خداوند عالم ہے کہ جو کچھ ان لوگوں نے حاصل کیا ہے۔

اس کی جزا دے گا اور اسی طرح کی یہ آیہ شریفہ ہے:

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾[1]

انہیں وہی ملے گا جو کچھ انہوں نے حاصل کیا ہے اور تمہیں بھی وہی ملے گا جو تم نے کمایا ہے اور ان کے اعمال کی بنا پر تم سے باز خواست نہیں کی جائے گی۔

لہٰذا مؤمن کے لئے ضروری ہے کہ اپنی حفاظت وہدایت پر توجہ دے اور لوگوں کے درمیان پھیلتے ہوئے گناہ اور گمراہی کو دیکھے تو اس کے پاؤں نہ لڑکھڑائیں اور لوگ اسے اپنی طرف نہ کھینچ سکیں اور وہ بھی لوگوں سے سروکار نہ رکھے، اسی طرح کبھی بھی خود سے غافل نہ ہو جیسا کہ خداوند عالم نے فرمایا ہے:

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت: ۱۳۴۔

﴿قُل لاَّ یَستَوِی الخَبِیثُ وَالطَّیِّبُ وَلَو أَعجَبَکَ کَثرَةُ الخَبِیثِ فَاتَّقُوا اللّٰہَ یَا أُولِی الأَلبَابِ لَعَلَّکُم تُفلِحُونَ﴾[1]

اے نبی! کہہ دیجئے کہ پاکیزگی وناپاکی دونوں برابر نہیں ہیں، اگر گناہ وناپاکی کی کثرت آپ کو حیرت واستعجاب میں ڈال دے تو تقوائے الٰہی کا راستہ اختیار کریں، اے صاحبانِ عقل وخرد! امید ہے کہ تم لوگ کامیاب ہوگے۔

نیز یہ بھی فرمایا:

﴿وَلَا تَستَوِی الحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ﴾[2]

نیکی اور برائی دونوں برابر نہیں ہیں، پھر یہ بھی فرمایا:

''لَا یَضُرُّکُم مَن ضَلَّ إِذَا اهتَدَیتُم''۔

گمراہ لوگ تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے اگر تم ہدایت پا جاؤ۔

بنیاد واساس اس بات پر ہے جو کہ کہی گئی اور اشارۃً یہ فرمایا کہ نقصان نہیں پہنچائیں گے، اس سے مراد یہ ہے کہ گنہگاروں کے گناہ میں ملوث نہ ہوں اور مومنوں کو گمراہوں کے گناہ سے اثر قبول نہ کرنے کی ہدایت ہوتی ہے تاکہ وہ ہدایت کے راستہ کو نہ چھوڑیں۔

''جیسا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں: آج کی دنیا معنویت کے سہارے نہیں چلنے والی ہے اور یہ انسانوں کو ادیان ومعنویت کو اپنا نصب العین اور قانون نہیں بنانے دے گی۔ کیوں کہ معنویت فسطائیت کے دور میں اس وقت کے لوگوں کے لئے ٹھیک تھی اور چوں کہ اس وقت لوگ سادگی پسند اور معمولی علم ودانش سے بہرہ مند ہونے کے ساتھ بہت ہی نچلی سطح کے تمدن کے مالک تھے لیکن آج کے زمانے کے لئے کہ جس میں لوگوں میں انقلابی تبدیلی آچکی ہے اور وہ زمانہ گذر چکا ہے۔

---

[1] سورۂ مائدہ، آیت: ۱۰۰۔

[2] سورۂ سجدہ، آیت: ۳۴۔

خداوند عالم یہی بات ان کی زبانی نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿وَ قَالُوا إِنْ نَتَّبِعِ الْهُدَى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَا﴾[1]

اس آیت کا مختصر مفہوم یہ ہے کہ اگر ہم آپ کی ہدایت کو جو کہ برحق ہے قبول کرلیں تو ہمیں شہر بدر کردیا جائے گا۔

''اسی طرح یہ آیت اس بات سے منع کرتی ہے کہ ان کی گمراہی سے خوف زدہ ہو کر ہدایت سے خائف ہوجایا جائے اور اپنے خیال میں ان کی روک تھام پر لگ جائیں اور خود کو بھلا بیٹھیں اور آہستہ آہستہ ان کی طرح گمراہ ہوجائیں۔''[2]

اس آیت سے ملتی جلتی ایک روایت میں منقول ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

''خود کی اصلاح کرو اور دوسروں کی لغزشوں کو تلاش مت کرو کیوں کہ اگر صالح ہو گے تو دوسروں کی گمراہی تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گی۔''[3]

علامہ حدیث کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

یہ روایت ہمارے پہلے والے ایک نکتہ کے بیان سے مطابقت کرتی ہے اور وہ نکتہ یہ تھا کہ ہم نے کہا تھا کہ آیۂ شریفہ فرماتی ہے: انسان کو لوگوں کی حالت کو سنوارنے کے سلسلہ میں رائج اور معمول سے زیادہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرنا چاہیے، اسی کے ساتھ خود سے غافل بھی نہ ہونا چاہیے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کرنے کا مشورہ دیا جانا چاہیے۔

---

[1] سورۂ قصص، آیت:۵۷۔

[2] المیزان، ج:۶، ص:۲۴۱۔

[3] تفسیر قمی، ص:۱۸۸ نقل از میزان، ج:۶، ص:۲۶۰۔

گمراہوں کے سلسلہ میں مؤمنوں کا فریضہ

جو چیز ہر مؤمن پر واجب ہے وہ لوگوں کو خداوند عالم اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جانب دعوت دینا ہے اور مختصر یہ کہ معمولی طور پر ان کی ہدایت کے اسباب کی فراہمی ہے تاہم اس کے اثر کو خدا پر چھوڑ دینا چاہیئے کیوں کہ سارے امور اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔

اسی کے ساتھ لوگوں کو معنوی ہلاکت سے نجات دلانے کے لئے خود کو ہلاکت میں ڈالنا بھی صحیح نہیں ہے کیوں کہ خدا نے اس طرح کا کوئی حکم نہیں دیا ہے اور نہ ہی کسی کو کسی کی برائی کی خاطر مواخذہ کیا ہے اور کوئی بھی کسی دوسرے پر خدا کا وکیل نہیں ہے۔

''بنابریں آیت کے معنی وہی ہیں جو مندرجہ ذیل آیات کے تحت بیان ہوئے ہیں:

﴿فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَفْسَکَ عَلَی آثَارِهِمْ إِن لَّمْ یُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِیثِ أَسَفاً إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْأَرْضِ زِینَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَیُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَیْهَا صَعِیداً جُرُزاً﴾[1]

اے محمد! کیا آپ صرف اس لئے کہ آپ کی قوم ایمان نہیں لا رہی ہے خود کو غم واندوہ سے ہلکان کرنا چاہتے ہیں۔ جو کچھ زمین پر ہے وہ ہم نے اس کے لئے زینت قرار دی تا کہ لوگوں کو آزما سکیں کہ ان میں سے کون نیک عمل کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ جو کچھ زمین پر ہے اسے ہم مٹی میں بھی ملا سکتے ہیں۔

جو کچھ بیان ہوا اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اس آیت اور دین کی دعوت پر مبنی آیتوں نیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آیتوں میں کوئی فرق نہیں ہے کیوں کہ یہ آیت مؤمنوں کو اس بات سے منع کرتی ہے کہ گمراہوں کو ہدایت کا راستہ دکھانے کی وجہ سے خود کی ہدایت کو نہ بھلا

---

[1] سورۂ کہف: آیت: ۸۔

بیٹھیں اور لوگوں کو نجات دلانے کی وجہ سے خود کو معنوی ہلاکت میں نہ ڈالیں۔[1]

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تعمیر نفس کا موجب

خداوند عالم اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی طرف دعوت دینا ایک طرح سے تعمیر نفس کرنے، اپنا خیال رکھنے اور راہ خدا کو سر کرنے اور فریضۂ الٰہی کے انجام دینے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ (کیوں کہ امر بالمعروف سماجی انحراف کے عوامل اور نفس کی آلودگی سے روک تھام کا عامل اور مقابلہ کرنے والا عنصر ہے) اس کے باوجود کیا ہوسکتا ہے کہ کوئی یہ احتمال دے کہ مورد بحث آیت دعوت دین اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی آیتوں کے خلاف ہے یا ان کی ناسخ ہے؟

''خداوند عالم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اسلام کے روحانی وجسمانی واضحات ومشخصات میں شمار کرتے ہوئے ایک ایسے ستون کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے کہ جس کی بنیاد واساس پر دین کو قائم واستوار کیا ہے:

﴿قُلْ هَـٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي﴾[2]

کہہ دو کہ یہ میری اور میرے پیروکاروں کی راہ وروش ہے کہ جس کے تحت لوگوں کی بینائی ودانائی کے ساتھ لوگوں کو خدا کی جانب بلاتے ہیں۔ نیز یہ بھی فرمایا:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾[3]

تم بہترین امتی تھے جو کہ لوگوں کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے باز رکھتے ہو لہٰذا ہر مؤمن پر واجب ہے کہ لوگوں کو مکمل بصیرت کے ساتھ خدا کی جانب دعوت دے اور الٰہی واجب کے عنوان سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے لیکن

---

[1] المیزان، ج:۶، ص:۲۴۰، ۲۴۱۔

[2] سورۂ یوسف، آیت:۱۰۸۔

[3] سورۂ آل عمران، آیت:۱۱۰۔

اسی کے ساتھ وہ اس بات پر مجبور اور ذمہ دار نہیں ہے کہ راہ ہدایت کے لئے غصہ اور شدّت عمل کا سہارا لے کر گمراہوں کو ہدایت کے لئے خود کو ہلاکت میں ڈالے۔[1]

ابی امیہ شعبانی سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں ابا ثعلبہ خشنی کے پاس آیا اور کہا: اس آیت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ پوچھا کون سی آیت؟ میں نے کہا:

''یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ''

کے بارے میں! انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم میں نے ایک آگاہ شخص سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جب میں نے رسول خداؐ سے اس آیت کا معنی پوچھا تو آنحضرتؐ نے فرمایا: اس آیت کا مطلب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ترک کرنا نہیں ہے، بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر اس وقت تک عمل کیا جانا چاہیئے جب تک کہ لوگوں کے درمیان بخل کی اطاعت عمل میں آتی رہے اور نفسانی خواہشات کی پیروی ہوتی رہے اور دنیا کو آخرت پر مقدم قرار دیا جاتا رہے نیز ہر کوئی اپنے افکار اور اظہار خیال کا شیدائی بنا رہے تو ایسی حالت میں آدمی کو اپنا خیال رکھتے ہوئے عوامی کاموں سے کنارہ کشی اختیار کر لینی چاہیئے۔ ایسے مواقع اور ایام میں صابرین کے کام اور صبر کی مثال اس آدمی کے کام جیسی ہے کہ گویا اس نے اپنے ہاتھوں میں جلتے ہوئے انگارے تھام رکھے ہوں اور ایسے موقع پر جو لوگ اپنے فریضے پر عمل کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے اور ان کا اجر ایسا ہے کہ گویا پچاس آدمیوں کے اس طرح کے کام کا اجر صرف ایک آدمی کو مل گیا ہو۔[2]

---

[1] المیزان، ج:۶، ص:۲۴۱،۲۴۲۔

[2] درالمنثور، ج:۲، ص:۳۴۰، نقل از المیزان، ج:۶، ص:۲۶۱۔

دوسری فصل

جسم کی معرفت

جسم کی معرفت

نفس کی ہمواری کی کیفیت

''ہم نے بتایا کہ آیتوں سے اس بات کا استفادہ ہوتا ہے کہ خداوند عالم کی جانب جانے والا انسان کا راستہ نفس انسانی سے ہو کر گذرتا ہے کیوں کہ انسان کے علاوہ اس کا کوئی اور دوسرا راستہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ وہی ہے جو گونا گوں اور مختلف درجات و مراحل پر تبدیلئ حالات کو مدنظر قرار دے سکتا ہے۔ وہ کبھی جنین، کبھی بچے، کبھی جوان اور بوڑھے کے حالات و زمانے سے گذرتا ہے اس کے بعد عالم برزخ میں اپنی زندگی کو جاری رکھتا ہے۔ پھر روز قیامت، پھر جنت یا جہنم میں زندگی گذارتا ہے۔ ''مختصر یہ کہ وہ راستہ جو انسان اپنے وجود کے آغاز سے انجام تک زندگی گذار رہا ہے وہ خود انسان ہے''۔[1]

اس راہ کا کچھ حصہ جسمانی و مادی حیات میں ظاہر ہوتا ہے لہٰذا ہم اس فصل کے تحت قرآن مجید اور تفسیر المیزان کی نظر سے ان مراحل کا جائزہ لیں گے۔

بے نام ونشان چیز

﴿هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ۚ إِنَّا خَلَقْنَا

---

[1] المیزان، ج:۶،ص:۲۴۴۔

الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعاً بَصِيراً ﴾[1]

کیا انسان کے اوپر ایسا دور اور مرحلہ نہیں گذرا ہے کہ جب وہ قابل ملاحظہ اور لائق ذکر چیز نہ تھا؟ ہم نے اسے مخلوط نطفہ (مختلف مواد) سے خلق کیا...

اس آیت میں سوال، مطلب کی تثبیت کے لئے ہے اور نتیجہ میں مطلب ومعنی کو سربستہ طور پر بیان کیا جارہا ہے اور وہ معنیٰ یہ ہے کہ یہ بات قطعی اور مسلم ہے کہ ایک دن اور زمانہ ایسا بھی تھا کہ جس وقت انسان کا وجود معدوم تھا اور ہوسکتا ہے کہ اس مفسر کی اس آیت کے کلمہ ''ھل'' سے مراد ''قد'' یعنی تاکید کے لئے ہوسکتا ہے کہ یہی مقصد ہو نہ یہ کہ وہ کہے کہ ھل کا ایک مفہوم تاکید ہے جیسا کہ کچھ علماء نے ایسا خیال کیا ہے۔[2]

''اس آیت میں انسان سے مراد خود نوع بشر ہے لیکن یہ کہ کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد ابوالبشر آدم ہیں۔''[3]

جو بعد والی آیت سے میل نہیں کھاتا ہے کیوں کہ ابوالبشر آدمؑ کو نطفہ سے خلق نہیں کیا گیا ہے اور بعد والی آیت اسی انسان کے بارے میں کہتی ہے:

''اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ''

(ان آیات کا مطلب ومقصد یہ ہے کہ انسان کچھ نہیں تھا اور ہم نے اسے بے وقعت نطفہ سے پیدا کیا اور اس سے ہر انسانی فرد مراد ہے نہ کہ صرف حضرت آدم علیہ السلام!)

''لفظ حین بھی صرف ایک محدود وقت کا معنی دیتا ہے، اب یہ مختصر ہو یا طویل، اور دھر سے مراد طویل ولامتناہی زمانہ اور وقت ہے یعنی ایسا زمانہ جس کی ابتدا وانتہا معلوم و

---

[1] سورۂ دہر، آیت: ۱، ۲۔

[2] روح المعانی، ج: ۲۹، ص: ۱۵۱۔

[3] روح المعانی، ج: ۲۹، ص: ۱۵۱

مشخص نہ ہو۔"

"اور"شیئاً مذکوراً" کے جملہ کا مطلب ومقصد یہ ہے کہ انسان کوئی ایسی قابل ملاحظہ چیز نہ تھا کہ اس کو مذکورات کا حصہ قرار دیا جاتا مثال کے طور پر کوئی ایسی قابل ذکر چیز نہ تھی کہ جس کو زمین وآسمان اور خشکی وتری وغیرہ کے مقابلہ میں قرار دیا جا سکے۔ اس لئے کہ اس کا نام و نشان ہی موجود نہ تھا۔

انسان اس وقت خلق ہی نہیں ہوا تھا تو موجود کہاں سے ہوتا کہ دیگر مخلوقات کی طرح اس کا بھی نام لیا جاتا اور کہا جاتا کہ آسمان، زمین، درخت اور انسان وغیرہ۔"

"انسان کا مذکور ہونا اس کے موجود بالفعل ہونے کی طرف اشارہ ہے اور مذکور کا نفی ہونا یعنی یہ کہ بالفعل موجود نہ تھا بلکہ بالقوہ موجود تھا دوسرے لفظوں میں یہ کہ کوئی چیز تو تھا لیکن اس طرح نہیں کہ اس کو انسان کا نام دیا جا سکے۔ چوں کہ جانتے ہیں کہ کوئی چیز تھا لیکن ایسی چیز نہ تھا کہ مذکور کا نام دیا جا سکے، اس بات کی گواہی اس سے ہوتی ہے کہ ارشاد ہوتا ہے:

"اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ" یہ بات سمجھانے کے لئے کہ انسان نطفہ کی شکل میں موجود تھا لیکن بالفعل کی صورت اختیار نہیں کی تھی اور آیۂ شریفہ اور اس کے بعد والی آیتیں احتجاجی ضمن میں یہ باور کرانے اور سمجھانے کی کوشش کر رہی ہیں کہ انسان ایک ایسی (حادث) مخلوق ہے کہ جس کے معرض وجود میں آنے کے لئے ایک صانع اور بنانے والے کی ضرورت ہے جو اس کو بنا سکے اور ایک خالق کی ضرورت ہے جو اس کو خلق کر سکے اور ایسا تھا بھی کیوں کہ اس کے پروردگار نے اس کو پیدا کیا اور اپنی ربانی تدبیر کے ذریعہ اسے سماعت وبصارت کے وسائل سے آراستہ کیا تا کہ اس کے ذریعہ راہ حق کی طرف ہدایت پا سکے۔ یہ ایسا راستہ ہے کہ زندگی کے دوران اس پر چلنا اس کے لئے واجب قرار پاتا ہے، اب اگر اس نے کفر اختیار کیا تو خدا کے دائمی عذاب میں مبتلا ہوگا اور اگر شکر بجالایا تو دائمی خوشی وشادمانی اس کا مقدر ہوگی اور اس آیت کا مطلب یہ ہے

کہ ھَلْ اَتٰی۔ قَدْ اَتٰی: بہ تحقیق کہ انسان کے لئے لامحدود زمانہ کا ایک محدود زمانہ آیا جوایسی حالت میں تھا کہ بالفعل طور پرانسان مذکورات کی گنتی میں قرار نہیں پاتا تھا۔[1]

انسان پانی اورمٹی کا فرزند ہے

﴿وَ اللهُ خَلَقَكُم مِن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ أَزْوَاجاً﴾[2]

''یہ آیۂ شریفہ خلقت انسانی کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ خداوند عالم نے سب سے پہلے اسے اس مٹی سے پیدا کیا جواس کی دوران زندگی کا مبدأ ہے اوراسی کے ذریعہ اس کی تخلیق ہوتی ہے اور پھراس کو نطفہ کی شکل میں جو کہ اس کا قریبی مبدأ ہے، خلق کیا۔''

اس سلسلہ میں مفسرین کے خیالات میں فرق پایا جاتا ہے۔

۱۔ کچھ مفسرین کا یہ کہنا ہے کہ مٹی سے انسانوں کی تخلیق سے مراد، ان کے مورث اعلیٰ جناب آدمؑ کی تخلیق ہے۔ کیوں کہ ہر چیز کی نسبت اس کی اصل کی طرف دی جاتی ہے۔[3]

اورعلامہ طباطبائی کا کہنا ہے:

''ممکن ہے کہ اس بات کی تائیداس آیت کے ذریعہ کی جائے''خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ''[4]

انسان کو بڑی سخت اور سوکھی وکھنکھناتی پکی ہوئی مٹی سے پیدا کیا گیا۔[5]

---

[1] المیزان، ج:۲۰،ص:۱۹۳، ۱۹۴۔

[2] سورۂ فاطر،آیت:۱۱۔

[3] مجمع البیان، ج:۸،ص:۴۰۳۔

[4] سورۂ رحمٰن، آیت:۱۴۔

[5] المیزان، ج:۷،ص:۳۲۔

۲۔ بعض دیگر علماء نے کہا ہے: مجموعی طور پر کلام کا مقصد، بیان میں صرف خلقت آدم کا بیان ہے۔اس قسم کی تفسیر کے بارے میں علامہ فرماتے ہیں:

دوسری صورت کو اس آیہ شریفہ ﴿وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ﴾[1] کی طرح قرار دیا جاسکتا ہے۔

انسان کی خلقت کا آغاز مٹی سے کیا اور پھر اس کی نسل کو بے وقعت پانی سے قرار دیا۔[2]

۳۔ اور بعض دیگر لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد بھی انسانوں کی خلقت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی بطور اجمال و تفصیل، یعنی اس معنی میں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت کے ضمن میں انسانوں کی مٹی سے اجمالی خلقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور تفصیلی خلقت کی طرف بھی کہ ان کی خلقت نطفہ سے ہوئی ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے: ''ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ'' علامہ اس صورت حال کے بارے میں بھی فرماتے ہیں: ممکن ہے کہ اس تیسری وجہ اور صورتحال کی اس آیت کے ذریعہ تائید کی جائے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ﴾[3]

ہم نے پہلے تمہیں خلق کیا پھر تمہاری شکل وصورت بنائی پھر ملائکہ سے کہا کہ آدم کا سجدہ کرو۔[4]

''ان تینوں قسموں کے درمیان فرق یہ ہے کہ پہلی قسم میں انسانوں کی مٹی سے خلقت کے بارے میں ایک مجازی عقلی نسبت دی گئی ہے کیوں کہ انسانوں کو خاک سے نہیں

---

[1] سورۂ سجدہ، آیت: ۷، ۸۔

[2] المیزان، ج: ۱۷، ص: ۳۲۔ بہ نقل از مجمع البیان، ج: ۸، ص: ۴۰۳

[3] سورۂ اعراف، آیت: ۱۱

[4] المیزان، ج: ۱۷، ص: ۳۲۔

خلق کیا گیا ہے بلکہ ان کے جداعلیٰ کو خلق کیا گیا ہے۔''

دوسری قسم میں خلقت سے صرف اور صرف آدم کو مراد لیا گیا ہے وہ بھی مجازی طور پر لیکن نسبت میں مجاز نہیں ہے بلکہ کلمہ ' کُم میں مجاز ہے یعنی خداوند عالم نے خطاب میں نسل آدم کو قرار دیا ہے اور اس خطاب میں انسان نہیں بلکہ ان کے جدّ اعلیٰ کو قرار دیا ہے، بنابریں یہاں پر ''کُم'' مجازی ہے اور ''کُم''، یعنی ''تمہارے'' کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ''آپ کے جداعلیٰ'' کو مراد و معنیٰ قرار دیا گیا ہے)

اور تیسری قسم میں مراد ہر فرد انسان کی مٹی سے خلقت ہے جو کہ حقیقی ہے نہ کہ مجازی تاہم یہ خلقت اجمالی ہے تفصیلی نہیں ہے، اسی بات سے تیسری قسم دونوں قسموں سے کہ جنہیں بیان کیا گیا، فرق پیدا کردیتی ہے۔[1]

البتہ یہ فرق بیان میں ہے اور معنیٰ کے لحاظ سے چنداں اہمیت نہیں رکھتا ہے کیوں کہ علامہ کا ماننا ہے کہ پہلی قسم جو بتائی کہ تمہیں مٹی سے پیدا کیا گیا تخلیق کے دوران مبدأ کی جانب اشارہ ہے اور آخری بحث میں سبھی انسانوں کی اجمالی وہمہ جانبہ خلقت کو آدم کی مٹی سے قرار دیا ہے اور پھر بعد میں یہ فرمایا کہ تمہیں نطفہ سے پیدا کیا، اس سلسلہ میں علامہ کے عقیدہ کے مطابق اس کی تخلیق کے نزدیکی مبدأ کو ذکر کیا ہے جب کہ آخری نظریہ میں انسانوں کی تخلیق کو تفصیلی مبدأ کا ذکر و اشارہ کیا ہے۔

مخلوط نطفہ

﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ﴾[2]

''نطفہ کا حکم درحقیقت مختصر سے پانی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور پھر یہ استعمال کے

---

[1] المیزان، ج: ۱۷، ص: ۳۲

[2] سورۂ دہر، آیت: ۱، ۲۔

لحاظ سے مردانہ آب نشاط کے عنوان سے کہ جس سے تولید نسل عمل میں آتی ہے استعمال میں اصلی معنیٰ میں غلبہ حاصل کرلیا۔''

امشاج کا کلمہ (مَشیج) کی جمع ہے یا (مَشَجٌ) یا (مَشِجٌ) ہے۔

ان تینوں کلمات کے معنیٰ مخلوط و ممتزج کے ہیں اور اگر اس صفت سے نطفہ مراد لیا ہے تو اس کے مختلف اجزاء کے اعتبار سے یا نر و مادہ کے آب نشاط کے آپس میں ملنے کو نطفہ کا نام دیا گیا ہے۔

جنین کا ارتقائی مرحلہ

لفظ ''ابتلاء'' کہ جس سے لفظ ''نبتلیه'' مشتق ہے اس کا مطلب کسی چیز کا ایک حالت سے دوسری حالت میں ایک طریقہ سے دوسرے طریقہ کی حالت میں منتقل ہونا ہے مثال کے طور پر سونے کو بھٹی میں ڈال کر پگھلایا جاتا ہے تا کہ جس حالت اور شکل میں چاہیں ڈھال سکیں۔

''خداوند عالم انسانوں کا امتحان لیتا ہے یعنی نطفہ سے اس کی تخلیق کرتا ہے اور پھر اس نطفہ کو لوتھڑے میں اور پھر اسے جسم کی شکل دے کر اعضاء و جوارح عطا کرتا ہے پھر دیگر انسانوں کی طرح اس کی دوسری تخلیق عمل میں لاتا ہے۔''[1]

﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَاماً فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْماً﴾[2]

''لفظ ''علقه'' خشک خون کے ٹکڑے کے معنیٰ میں ہے اور لفظ ''مضغه'' چبائے ہوئے گوشت کے ٹکڑے کے معنیٰ میں ہے اور ''عظام'' ہڈی کے معنیٰ میں ہے۔'' اور اس جملہ میں جہاں ارشاد فرمایا: فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْماً ایک لطیف کنایہ کی طرف استعارہ ہے'' مورد نظر استعارہ یہ ہے کہ ہڈی کے اوپر گوشت کے چڑھنے اور لپٹنے کو لباس سے تشبیہ دی ہے جو ہڈی کے پیکر کو چھپائے

---

[1] المیزان، ج:۱۷، ص:۲۰۳۔

[2] سورۂ مومنون، آیت: ۱۲، ۱۴

ہوئے ہے۔

نطفہ کے تکاملی مراحل

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ، ثُمَّ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَكِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَاماً فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحماً...﴾[1]

اور بے شک ہم نے انسان کو منتخب مٹی کے گارے سے خلق کیا، پھر ہم نے اس کو نطفہ کی صورت میں مخصوص و محفوظ جگہ قرار دیا پھر اس نطفہ کو بندھے ہوئے خون کی صورت میں اور اس کے بعد اس کو چبائے ہوئے گوشت (لوتھڑے) کی شکل دی اور پھر اس سے ہڈی بنایا اور پھر اس ہڈی پر گوشت کا لباس اڑھایا۔

"مجمع البیان میں آیا ہے کہ لفظ سلالۃ نام ہے ہر اس چیز کا جو کسی دوسری چیز سے باہر نکالی جائے۔"

کساحہ کے وزن پر جو کہ ہر اس چیز کے لئے اسم ہے جس کی جاروب کشی کی جائے۔[2]

اور ظاہر سیاق یہ ہے کہ مراد نوع انسانی ہے کہ جس کے نتیجہ میں بشمول آدم علیہ السلام ان کی ساری ذریت کو بھی محیط ہے اور خلق سے مراد ابتدائی خلق ہے کہ جس میں آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا اور پھر ان کی نسل کو نطفہ سے قرار دیا ہے، یہ آیت اور بعد کی آیت اس آیت کے معنیٰ میں میں ہے کہ جہاں اللہ نے فرمایا:

﴿وَبَدَءَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَآءٍ مَهِينٍ﴾۔[3]

انسان کی تخلیق کا آغاز مٹی سے کیا پھر اس کی نسل کو بے وقعت پانی سے جو کہ مختصر تھا قرار دیا۔

---

[1] سورۂ مومنون، آیت: ١٢، ١٤۔

[2] مجمع البیان، ج:٧، ص:١٠٠۔

[3] سورۂ سجدہ، آیت: ٧، ٨۔

اس بات کی تائید خداوند عالم کے قول اور اس جملہ کے بعد ہوتی ہے جس میں یہ فرمایا ہے کہ "ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً" یعنی انسان کی مٹی سے ابتدائی خلقت کے بعد اس کے باقی کے حصہ کو نطفہ کی شکل میں قرار دیا۔ چونکہ اگر انسان سے مراد صرف فرزندان آدم علیہ السلام ہوتے اور خود آدم علیہ السلام شامل نہ ہوتے اور نتیجہ کے طور پر مٹی سے انسان کی خلقت کا مقصد و مطلب یہ ہوتا کہ فرزندان آدم کا نطفہ ان کی مٹی میں تھا تو ایسی حالت میں اس طرح فرمانا چاہیے تھا:

﴿ثُمَّ خَلَقْنَاهُ نُطْفَةً ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً...﴾

یعنی انسان کو نطفہ سے خلق کیا پھر نطفہ سے علقہ اور علقہ سے مضغہ کو خلق کیا...۔

حالانکہ یہ فرمایا ہے: "ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً" یعنی اس کے لئے نطفہ قرار دیا ہے۔[1]

یہ بات جاننا ضروری ہے کہ (خلق) اور (جعل) میں فرق ہے۔ جعل اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی چیز پہلے سے نہ ہو اور جعل کے موقع پر پہلی مرتبہ اسے شکل حاصل ہوئی ہو مثال کے طور پر نطفہ جو کہ خلقت انسانی کا سب سے پہلا مرحلہ ہے اس سے پہلے وہ قابل ذکر نہ تھا اور نئی ایجاد عمل میں آئی ہے کہ جس کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا تھا اور سرانجام کون سی شکل اختیار کرے گا لیکن خلق وہ چیز ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے اس کی کوئی شکل و صورت تھی اور خلقت کے موقع پر اس نے نئی شکل اختیار کر لی ہو جیسے کہ علقہ جو کہ پہلے نطفہ کی شکل میں تھا پھر اس نے علقہ یعنی بندھے یا سخت ہو چکے خون کی شکل اختیار کر لی۔

رحم کی محفوظ منزل

﴿ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَكِينٍ﴾[2]

پھر ہم نے نسل آدم کو نطفہ کی شکل میں محفوظ جگہ پر قرار دیا۔

---

[1] المیزان، ج:۱۵، ص: ۲۳، ۲۴۔

[2] سورۂ مومنون، آیت: ۱۳۔

"کلمۂ قرار مصدر ہے جس سے قرار گاہ (مقررہ مقام) ارادہ کیا گیا ہے تا کہ مبالغہ کا معنی دے سکے اور قرار مکین سے مراد عورت کا رحم ہے کہ جہاں پر نطفہ قرار پاتا ہے اور مکین کا لفظ رحم کی صفت ہے اور رحم کی توصیف مکین کے ذریعے سے یا تو اس وجہ سے ہے کہ اس کے اندر خرابی و برباد ہونے سے بچاؤ اور حفاظت کی صلاحیت پائی جاتی ہے یا پھر اس وجہ سے ہے کہ نطفہ رحم کے اندر زیست و حیات اور دوام کی توانائی و صلاحیت حاصل کرتا ہے۔ الغرض یہ کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ پھر ہم نے انسان کو نطفہ عطا کیا تا کہ وہ رحم کے اندر توانائی حاصل کرے جس طرح کہ ابتداء میں اسے مختصر مٹی سے بنایا اور اس کی تعبیر یہ ہوئی کہ ہم نے انسان کی خلقت کو اُس صورت سے اِس صورت میں تبدیل کر دیا ہے۔"[1]

توحید کی نشاندہی و جلوہ

﴿خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾[2]

انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔

انسانوں کی تخلیق اور نطفہ کے ارتقاء کے بارے میں غور وخوض کا ماحصل اور مطالعات کا نتیجہ آیات الٰہی میں فکر اور بصیرت کی غرض سے ہے۔

آیۂ شریفہ انسانوں کے سلسلہ میں تدبیر الٰہی کی طرف اشارہ اور نشاندہی کرتی ہے ایسی تدبیر کہ جس کے مرحلہ کا آغاز خون کے لوتھڑے سے ہوتا ہے جب تک کہ خلقت کے لحاظ سے مکمل انسان میں تبدیل نہیں ہو جاتا ہے اور اس کے اندر حیرت انگیز افعال و صفات وجود میں نہیں آجاتے ہیں، بنابریں انسان اس وقت تک مکمل انسان نہیں ہوجاتا جب تک کہ خدا کے ذریعہ عطا کردہ تخلیقی

---

[1] المیزان، ج:۱۵، ص:۲۴۔

[2] سورۂ علق، آیت:۲

کارناموں پر غور وفکر اور اس کی خلقت کی تدبیر کا قائل نہ ہو جائے۔

اس لحاظ سے یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ خلقت کو خدا کی جانب سے مانیں اور تدبیر خلقت کو غیر خدا کی طرف سے قرار دیں، جس دلیل کی بنیاد پر وہ خالق انسان ہے اسی دلیل کی بنیاد پر اس کا مدبر بھی ہے لہٰذا انسان کے پاس اس بات کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے کہ خدائے واحد کو اپنا رب قرار دے۔

''اس لئے مورد بحث جملہ ربوبیت میں توحید پر احتجاج کیا گیا ہے۔''[1]

اس معنیٰ میں کہ خالق اور پیدا کرنے والا ایک ہی ہے۔ (وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ)

اس لحاظ سے آیات اور مطالب کا مطلب و مفہوم پیغمبر اسلامؐ اور امیر المؤمنینؑ کے کلام سے واضح ہو جاتا ہے: ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ''۔

تخلیق وتقدیر کے اظہار

﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ﴾[2]

وہ خدا وہ ہے جو رحم مادر میں رکھ کر جیسی چاہے تمہاری صورت بنا سکتا ہے۔

علامہ طباطبائی اس مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں یہ روایت نقل کرتے ہیں:

کافی میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

خداوند عالم جب بھی ارادہ کرتا ہے کہ اس نطفہ کو کہ جسے پہلے سے رحم اور صلب آدم میں قرار دے رکھا تھا اور اس سے پیمان لے رکھا تھا، خلق کرے اور جو کچھ ازل سے ہی صلب آدم میں نطفہ کی شکل میں قرار دے رکھا تھا ظاہر کرے تو مرد کے جذبات کو تحریک کرتا ہے تا کہ وہ عورت کے ساتھ ہم بستری و جماع کرے اور عورت کے رحم کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنا منہ کھول دے تا کہ میری

---

[1] المیزان، ج:۲۰، ص:۵۴۸۔

[2] سورۂ آل عمران، آیت:۶۔

نفوذ پذیز قضا و قدر تیرے اندر محقق ہو جائے۔ (اب جب کہ فرمان الٰہی صادر ہو چکا ہوتا ہے) تو رحم اپنے دہانہ کو کھول دیتا ہے اور نطفہ عورت کے رحم میں پہنچ جاتا ہے اور چالیس دن تک جولانیاں دکھاتا ہے اور گھومتا رہتا ہے یہاں تک کہ علقہ (لوتھڑے) کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پھر چالیس دنوں تک لوتھڑے کی شکل میں پڑا رہتا ہے۔

اس کے بعد مضغہ بن جاتا ہے پھر چالیس دنوں کے بعد ایک گوشت کی شکل میں آجاتا ہے کہ جس کے اردگرد جال نما باریک جھلّیاں ہوتی ہیں پھر خداوند عالم اپنے ان دو فرشتوں کو کہ جو خلقت کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور جو خدا چاہے وہ رحم مادر میں خلق کرنے کا اختیار رکھتے ہیں، یہ دونوں فرشتے عورت کے منہ کے راستہ رحم کے اندر داخل ہوتے ہیں اور خود کو عورت کے رحم (کہ جہاں ماؤں کے ارحام اور آباء و اجداد کے اصلاب سے منتقل ہونے والی قدیم روح ہے) میں پہنچاتے ہیں۔ پھر اس گوشت کے لوتھڑے میں پروردگار کی اجازت سے روح حیات و بقا ڈالتے ہیں، اس کے بعد ان کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اس کے اندر آنکھ، کان، ناک اور دیگر اعضاء و جوارح بنا کر ایک انسان کی شکل بنا دیں۔

''اس کے بعد پروردگار عالم ان دونوں فرشتوں کو بذریعۂ وحی حکم کرتا ہے کہ میں نے اس بچہ کے لئے جو قضا و قدر معین کی ہے اور جو حکم اس کے لئے نافذ کیا ہے اسے لکھ لیں اور اس کے لئے بدا یعنی قضاء و قدر میں تبدیلی کے لئے بھی جگہ چھوڑ دیں۔''

''وہ دونوں فرشتے پوچھتے ہیں کہ خداوندا! ہمیں معلوم نہیں ہے کہ تو نے اس بچہ کے لئے کیا قضا و قدر معین کی ہے لہٰذا تو خود ہی بتا دے تاکہ ہم اسے لکھ لیں۔

خداوند عالم فرماتا ہے کہ اپنا سر اٹھاؤ اور بچہ کی ماں کے سر کی طرف دیکھو، جب وہ سر اٹھا کر دیکھتے ہیں تو انہیں ایک تختی دکھائی دیتی ہے جو ماں کی پیشانی پر لٹک رہی ہے اور اس پر کچھ لکھا ہوا ہے اور اس کے اندر بچے کی شکل و صورت، اجل و میثاق، سیرت و

جمال اور سعادت وشقاوت سب کچھ موجود ہے۔

''ان دونوں فرشتوں میں سے ایک فرشتہ وہ تختی پڑھتا ہے اور دوسرا اس بچے کے لئے لکھتا ہے اور بچہ کی ہر ایک خصوصیت میں خدا کے لئے بدأ کی شرط کو لکھتا ہے یعنی خدا کے لئے قضاوقدر میں تبدیلی کی جگہ کو چھوڑ دیتا ہے۔''

''پھر اس نوشتہ کو مہر لگا کر بچے کی دونوں آنکھوں کے بیچ میں رکھ دیتے ہیں، اس کے بعد اس بچہ کو شکم مادر میں کھڑا کر دیتے ہیں اور رحم مادر میں چھوڑ کر باہر چلے جاتے ہیں۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ رحم مادر میں بچہ ادھر ادھر کروٹیں لیتا ہے، قلا بازیاں کھاتا ہے اور اوپر نیچے ہوتا ہے جو کہ اس کی سرکشی اور طغیانی کی نشانی ہوا کرتا ہے۔

جب بچہ کی پیدائش کا وقت پورا ہو جاتا ہے چاہے بچہ کامل ہو یا ناقص الخلقت ہو تو خداوند عالم رحم مادر کو حکم دیتا ہے کہ اپنے منہ کو کھول دے تا کہ میری مخلوق زمین پر قدم رکھے اور میری قضاوقدر اس پر جاری ہو کہ اب اس کے باہر نکلنے کا وقت آچکا ہے۔ اب رحم اپنا دہانہ کھول دیتا ہے پھر بچہ کروٹ لیتا ہے اور سر کو اوپر اور پیروں کو نیچے کر دیتا ہے تا کہ ماں کے جننے میں سہولت اور بچہ کی پیدائش میں آسانی ہو سکے۔''

پھر خداوند عالم زاجر نامی فرشتہ کو حکم دیتا ہے کہ بچہ کو ایذاء پہنچائے تا کہ اس کی ایذاء رسانی سے بچہ میں حرکت پیدا ہو اور وہ دنیا میں بہ آسانی قدم رکھ سکے۔ اگر اس کام سے بھی وہ پیدا نہ ہوا تو دوبارہ اس کو اذیت دے تا کہ حرکت میں آئے اور رحم مادر سے باہر نکل سکے اور جب دنیا میں آئے تو اس ایذا رسانی کی وجہ سے حالت گریہ میں باہر آئے۔[1]

---

[1] المیزان، ج: ۳، ص: ۲۲، ۲۳ بنقل فروع کافی، ج: ۶، ص: ۱۳۔

ناتوانی سے ناتوانی تک

﴿اللهُ الَّذِیْ خَلَقَکُم مِّن ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِن بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِن بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفاً وَ شَیْبَةً یَخْلُقُ مَا یَشَاءُ وَهُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ﴾[1]

وہ اللہ ہی ہے کہ جس نے تمہیں حالت ضعف میں پیدا کیا اور ضعف کے بعد بے مثال طاقت عنایت کی اور جوانی کی طاقت کے بعد پھر کمزوری و بڑھاپے میں مبتلا کر دیا۔ خداوند عالم جو چاہے پیدا کر سکتا ہے وہ تو بہت ہی دانا و توانا ہے۔

''اللہ نے کمزوری سے خلقت کا آغاز کیا، یعنی تم لوگ آغاز خلقت میں کمزور تھے اور اس کمزوری کا مصداق جیسا کہ موازنہ سے پتہ چلتا ہے ابتدائے طفولیت ہے اور یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ یہ نطفہ پر بھی صادق آتا ہو۔''

''اور کمزوری کے بعد کی طاقت سے مراد، بچہ کا طفولیت سے نکل کر بلوغ تک پہنچنا ہو اور طاقت کے بعد کمزوری تک پہنچنے سے مراد، بڑھاپے کا دور ہو۔ بنابریں کلمۂ شیبہ (یعنی بڑھاپے) کو کمزوری پر معطوف کیا جانا چاہیئے تاکہ اس کی تفسیر کی جا سکے اور اگر کمزوری و طاقت کو نکرہ کی حیثیت سے شمار کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابہام پر دلالت کرے اور میزان معین نہ ہو کیوں کہ افراد کا اس میں اختلاف ہے۔ (کیوں کہ بعض کی جوانی کی مدت طویل ہوتی ہے، بعض کی بڑھاپے کی مدت طویل ہوتی ہے اور کچھ لوگوں کی عمر طویل اور کچھ لوگوں کی عمر کم ہوا کرتی ہے)۔''

''یَخْلُقُ مَا یَشَاءُ'' یعنی وہ جو چاہتا ہے خلق کرتا ہے، جیسا کہ اس نے کمزور کو چاہا اور خلق کر دیا، پھر طاقتور کو بنانا چاہا اور بنا دیا اور آخر میں کمزور کو چاہا اور خلق کر دیا اور اس بیان میں صریحی طور پر یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ ان تین حالتوں کا پے در پے پایا جانا، خلقت کے مقولہ

---

[1] سورۂ روم، آیت: ۵۴

سے مربوط ہے چوں کہ انسانوں کو ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنا جہاں اس کی تدبیر میں شمار کیا جاتا ہے وہیں اس کا خلق بھی شمار ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ سب فعل خدا ہے کیوں کہ وہ اشیاء کا خالق ہے۔[1]

مادی حرکت کا اختتام

﴿ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ﴾[2]

پھر بہ تحقیق تم ان مراحل کے طے کرنے کے بعد مر جانے والے ہو۔

یہ جملہ، تدبیر الٰہی کے مراحل کا آخری بیان ہے اور یہ بتلاتا ہے موت ان مراحل میں سے ایک ہے کہ جس کو قضا وقدر الٰہی کے راستے میں وجوبی اور یقینی طور پر قرار پانا چاہیئے اور سبھی کے لئے ضروری ہے کہ اس کو طے کریں۔

اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ موت ایک حقیقت ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہوا:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً﴾

ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور ہم تم کو خیر و شر کے ذریعے سے آزمائیں گے۔

﴿ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ﴾

پھر تم کو روز قیامت اٹھایا جائے گا۔

اور یہی اس تدبیر کا انجام انسان کے تکاملی راستے کا آخری نقطہ ہے کیوں کہ جو بھی وہاں پر قدم رکھے وہ پھر دوبارہ واپس نہیں آسکتا۔

---

[1] المیزان، ج:۱۶، ص:۳۰۷، ۳۰۸۔

[2] سورۂ بلد، آیت: ۴۔

رنج ودرد بھری سیر

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ﴾

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کو پریشانیوں میں خلق کیا۔

''کبد'' کا لفظ رنج ودرد اور خستگی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور مورد بحث جملہ پچھلی آیت کے قسم کا جواب ہے کہ جس میں کہا گیا ہے کہ ''وَوَالِدٍ وَمَا وَلَدَ'' یعنی باپ اور بیٹے کی قسم، یہ تعبیر کہ خلقت انسانی ''کبد'' میں ہے یعنی مشکلات سے روبرو ہے، ہمیں یہ بات سمجھاتی ہے کہ انسان کو مشکلات وزحمات اور پریشانیوں ومشقتوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے اور یہ بات کسی بھی عاقل کے لئے پوشیدہ نہیں ہے کہ آدمی تب تک کسی بھی نعمت کو حاصل کرنے کے لئے تگ ودو میں نہیں پڑا کرتا جب تک کہ اس کے خالص کو نہ چاہے جو ہر نعقمت وکلفت اور ہر پریشانی وسردردی سے خالص ہو خوبی و پاکیزگی میں خالص ہو اور اس کا حصول بغیر زحمت ومحنت اور پریشانی ومصیبت اٹھائے ممکن ومیسر نہیں ہے اور کوئی بھی نعمت اسے حاصل ہونے والی نہیں ہے مگر رنج ومحن اور ان مصیبتوں اور زحمتوں کے اٹھانے کے بعد کہ جو اس کی زندگی کو تلخیوں سے بھر دیتی ہیں۔[1]

خلقت کا شاہکار

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾[2]

تقویم انسانی یعنی اس کو قوام واستحکام بخشا گیا ہو اور قوام انسانی کا مطلب یہ ہے کہ بقائے انسانی کے لئے ضروری ثبات واستحکام دیا گیا ہو۔ انسان سے مراد بنی نوع انسان ہے بنابریں نوع انسانی تخلیق کے بعد قوام واستحکام کی مالک ہے اور جو کچھ اس کی حفاظت کا ضامن ہے اس سے وہ بہرہ مند ہے اور وہ نہ صرف یہ کہ مضبوط ومستحکم ہے بلکہ خلقت کے لحاظ سے بہترین قوام

---

[1] المیزان، ج:۲۰، ص:۴۸۷، ۴۸۸۔

[2] سورۂ تین، آیت: ۴۔

کا مالک ہے۔

اس جملہ سے اور بعد کے جملہ سے کہ جس میں فرماتا ہے:

''ثُمَّ رَدَدْنَاهُ اَسْفَلَ سَافِلِینَ اِلَّا الَّذِینَ...'' یہ استفادہ ہوتا ہے کہ خلقت کے لحاظ سے انسان کو ایسا خلق کیا گیا ہے کہ اعلیٰ مدارج تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اپنے پروردگار کے جوار میں دائمی حیات اور شقاوت و بدبختی سے خلاصی پاتے ہوئے خالص سعادت حاصل کرسکتا ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ خداوند عالم نے اسے ایسی نعمتوں سے نوازا ہے کہ جس کے ذریعہ وہ منفعت بخش علم حاصل کرسکتا ہے نیز اسے عمل صالح کا وسیلہ بھی عنایت کیا ہے اور فرمایا ہے:

﴿وَ نَفْسٍ وَ مَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَ تَقْوَاهَا﴾[1]

لہٰذا جو کچھ کہ علم حاصل کیا اور جان چکا ہے اس پر ایمان لے آئے، اعمال صالحہ انجام دے اس کے سبب خداوند عالم اسے جانب کمال عروج حاصل کرنے کی توفیق اور بلندی عطا کرے گا اور جیسا کہ فرمایا ہے:

﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ﴾[2]

نیز اللہ نے یہ بھی فرمایا:

﴿وَ لٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ﴾[3]

قربانی کا گوشت خدا تک نہیں پہنچا کرتا، ہاں البتہ تمہاری نیک نیتی اور پرہیزگاری اس کی طرف پہنچتی ہے پھر اللہ کی طرف ارشاد ہوا:

﴿يَرْفَعِ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ﴾[4]

---

[1] سورۂ شمس، آیت: ۷، ۸۔

[2] سورۂ فاطر، آیت: ۱۰۔

[3] سورۂ حج، آیت: ۳۷۔

[4] سورۂ مجادلہ، آیت: ۱۱۔

اور اللہ نے یہ بھی فرمایا:

﴿فَأُولَئِکَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَى﴾[1]

اس طرح کی اور بھی دیگر آیتیں ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان کا مقام و مرتبہ بہت ہی اونچا ہے اور یہ خدا کی جانب سے کبھی ختم نہ ہونے والی عنایت ہے کہ جس کو خداوند عالم نے اجر کا نام دیا ہے جیسا کہ اس سورہ کی چھٹی آیت میں اشارہ ہوا ہے کہ جس میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

﴿فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ﴾[2]

لہٰذا اگر ہم سورۂ تین اور بلد کی دونوں آیتوں کو ایک جگہ قرار دیں تو دلچسپ نتیجہ سامنے آئے گا۔

سورۂ بلد میں اللہ نے فرمایا:

''لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ''

اور سورۂ تین میں فرمایا:

''لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ''۔

ان دونوں آیتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ خلقت انسانی کے دو پہلو ہیں اور جو راستہ وہ طے کرتی ہے اس کے بھی دو رخ ہیں: ایک تو سختی و پریشانی (کبد) والا مرحلہ اور دوسرا بلند پروازی اور جانب سعادت رواں دواں ہونے یعنی (احسن تقویم) والا مرحلہ۔

یعنی اس راستہ سے گذرنا کہ جو تخلیق الٰہی کا راستہ اور لحظہ بہ لحظہ خداوند عالم انسان کو ہستی عطا کر رہا ہے اور خلقت کو دوام و استمرار عطا کئے ہوئے ہے۔ یہ زندگی تمام مشکلات اور پریشانیوں اور روزگار زمانہ کے سرد و گرم، سختی و سستی اور اونچ نیچ سے بھرے حالات کے باوجود اعلیٰ علیین اور

---

[1] سورۂ طٰہٰ، آیت: ۷۵۔

[2] المیزان، ج: ۲۰، ص: ۵۴۱۔

جوار الٰہی کی جانب رواں دواں ہوتی ہے۔

اور اس کا ماحصل یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں پر غور وفکر خود ہمیں ہماری اپنی معرفت کراتی ہے اور ہمارے وجود میں انسانی سعادت وخوشبختی، شقاوت وسختی اور ان کے مرام ومقصود اور آیات الٰہیہ کی نشاندہی کراتی ہے اور خالق حکیم کے جمال کو اجاگر کرتی ہیں۔

فصل سوم

روح کا مرتبہ اور معرفت نفس

روحانی راستہ کا سفر

مادی جسم کے راستہ کی سیر کے بعد جو کہ ضروری اور ناگزیر تھی، روح کے مرحلہ اوراس کی شناخت سے متعلق راستہ کے سفر کی ضرورت کی نوبت آتی ہے۔ جسمانیت کے سلسلہ میں راستہ کا اختتام موت پر ہو گیا لیکن روح کا سفر برزخ وقیامت اوراس کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ تاہم روح کے سفر کو کامیابی کے ساتھ سر کرنے کے لئے روح کی حقیقت اوراس کے مقامات ومراتب کو پہچاننے کی ضرورت ہے تا کہ اس راہ پر چلتے وقت غلط راہ اختیار نہ کرلیں اور حقیقت سے دور نہ رہ جائیں۔

معرفت نفس کے سلسلہ میں روح کی شناخت پچھلی بحث یعنی جسمانیات کی شناخت سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری ہے اوراس کا مقام ومرتبہ بھی بڑا ہے اور پچھلا مرحلہ قہری واجباری سیر وسلوک پر مبنی تھا کہ جس کی معرفت صرف پروردگار اور مکمل مدبر وکلیم اور صاحب اختیار کے وجود کو آشکار کررہی تھی حدیث مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ کی ظاہری وسطحی مراتب کو عیاں کررہی تھی۔

لیکن روحانی راستہ پر چلنا اور سیر وسلوک کی منازل کو طے کرنا اس سے کہیں زیادہ اہم اور عظیم المرتبت ہے کہ اس کے تمام مطالب ودقائق کو رشتۂ تحریر میں لایا جائے اور وہ سیر حاصل ہو اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ باریک بال سے بھی ہزاروں بار زیادہ حرفہائے گفتنی اور اسرار مطالب نہفتہ ہیں لیکن اس سفر کے انجام وجہت کی تعیین میں علم وایمان اور عمل کا کردار بھی مقدر ساز ہوتا ہے

اور اس سفر کے دوران واضح ہوجاتا ہے کہ کون ہے جو اپنے نفس کو جہنمی بناتا ہے اور کس کی روح ہے جو بارگاہ اقدس اور فیض مقدس سے ملحق ہوکر قداست وسعادت حاصل کرتی ہے جیسا کہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام مناجات شعبانیہ میں فرماتے ہیں:

''خداوندا! غیر کی جانب سے نہایت جدائی اور خودتو اپنی طرف حرکت کی توفیق کو ہمارے نصیب فرما اور اپنے جمال کے دیدار کے ذریعے سے ہمارے دلوں کو روشن فرما تا کہ نور پر پڑے پردے کو ہٹا کر عظمت و بزرگی کے معدن تک رسائی حاصل کرلے اور ہماری روح میں دگرگونی ہوجائے اوروہ ترے عزِ قدس کی رفعت پر آویزاں ہوجائے۔''

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَاماً فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْماً ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾[1]

بے شک ہم نے انسان کو مٹی کے گارے سے خلق کیا پھر اس کے نطفہ کو بڑی مطمئن و مستحکم جگہ پر قرار دیا پھر اس نطفہ کو گوشت کے لوتھڑے میں تبدیل کردیا اور اس لوتھڑے کو مضغہ بنایا اور پھر مضغہ کو ہڈیوں پر گوشت کا لباس پہنایا۔ اس کے بعد اس کو ایک دوسری خلقت میں پیدا کیا۔ پس لائق تعریف ہے وہ خدا جو کہ بہترین خالق ہے۔

أَنشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ کی عبارت یعنی پھر اس کو ایک دوسری مخلوق میں تبدیل کردیا جناب راغب کے قول کے مطابق ''انشاء'' کسی چیز کے ایجاد اور اس کی پرورش کو کہتے ہیں، جیسا کہ ''نشا ونشاۃ'' وجود میں لانے اور پرورش کے معنیٰ میں ہیں اسی لئے نوجوان کو ناشی کہا جاتا ہے۔

اس جملہ میں سیاق کو خلقت سے انشاء میں تبدیل کردیا گیا ہے اور ارشاد ہوا ہے: ''ثُمَّ

---

[1] سورۂ مؤمنون، آیت: ۱۲، ۱۴۔

أَنشَأْنَاهُ خَلقاً آخَرَ" حالاں کہ یہ ارشاد ہو سکتا تھا کہ ثُمَّ خَلَقْنَاهُ... لیکن ایسا نہیں فرمایا اور یہ اس وجہ سے ہے کہ خالق کائنات یہ دکھانا چاہتا ہے کہ جو کچھ ہم نے خلق کیا ہے وہ کوئی الگ چیز اور ایک دوسری ہی حقیقت ہے اس سے جو کہ ابتدائی مراحل خلقت میں تھی۔ مثال کے طور پر علقہ باوجود اس کے کہ اپنے خاص اوصاف وخواص اور رنگ وطعم اور شکل وصورت میں اس نطفہ سے مختلف ہے لیکن اصلیت میں مادی ہونے اور مادی اوصاف کی بنا پر مادی ہے۔ بس فرق اتنا رہ گیا ہے کہ نطفہ کے جو اوصاف تھے وہ ختم ہو گئے لیکن اس نے اپنے ہی جیسی شکل اختیار کر لی جس کی نوعیت ایک ہے۔

"مختصر یہ کہ اگر چہ نطفہ والے صفات وخصوصیات علقہ میں نہیں ہیں پھر بھی اسی کی طرح ہے مثال کے طور پر اگر سفید نہیں تھا تو لال ہے لیکن دونوں کی اصلیت اور جنسیت ایک ہی ہے جس کا نام رنگ ہے۔"

لیکن خداوند عالم نے آخری اور بعد کے مرحلہ میں اسے جن اوصاف سے نوازا ہے کہ جس کی باعث وہ انسان کہلانے کے لائق ہوا وہ نہ پہلے والے اوصاف جیسے ہیں اور نہ ہی بالکل اس نوعیت کے ہیں، مثال کے طور پر آخری انشاء کے مرحلہ میں اسے حیات وطاقت اور علم حاصل کرنے کی ظرفیت کے مطابق علم عنایت فرمایا۔

"اس مرحلہ میں اس کو انفرادی وذاتی جوہر عطا کیا کہ جسے ہم کلمۂ "میں" سے یاد کرتے ہیں اور آخری مرحلہ میں ایسی چیز وجود میں آئی جو کہ بالکل ہی منفرد تھی۔"

انشأناہ میں جو ضمیر ہے (جیسا کہ کنایہ سے پتہ چلتا ہے) وہ انسان کی طرف پلٹتی ہے، جب کہ ہڈیوں پر گوشت کا غلاف چڑھا ہوا تھا، چوں کہ یہ چیز تھی اس لئے ایک دوسری خلقت وجود میں آگئی۔"[1]

---

[1] المیزان، ج:۱۵، ص:۲۵۔

جو چیز دوسری خلقت میں تبدیل ہوتی ہے وہ بعینہ وہی نطفہ ہے جس نے علقہ و مضغہ اور پھر ہڈیوں کی شکل والے مراحل کو طے کیا ہے۔[1]

یعنی صرف مرا ہوا جاہل و عاجز مادہ تھا پھر وہ زندہ اور عالم و قادر مخلوق کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے علاوہ وہ ایک ایسا مادہ تھا کہ جس کے اپنے صفات اور خواص تھے پھر وہ ایک ایسی چیز میں تبدیل ہو گیا کہ جس کے اندر اپنی سابقہ حالت سے الگ صفات و خواص وجود میں آ گئے لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے اس مرحلہ تک پہنچایا گیا جو کہ پہلے کی حالت سے الگ تھا اس لئے کہ یہ نہ تو اپنی اصلیت اور ذات میں پہلے جیسا ہے اور نہ ہی اپنے صفات میں پہلے جیسا ہے۔''[2]

جسم کے ساتھ روح کا اتحاد

﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ﴾[3]

جب میں نے انسان کو متوازن کیا تب اس میں اپنی روح پھونکی۔

''تسویہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو سیدھا اور متوازن کیا جائے تا کہ وہ خود پر منحصر ہو سکے اس طرح کہ اس کا ہر حصہ اپنی جگہ پر مستقر ہو سکے''۔

انسان کا تسویہ اور توازن بھی یہ ہے کہ اس کے ہر حصہ کو اپنی جگہ پر ویسا ہی ہونا چاہیئے جیسا کہ ہے اور ایسی حالت میں قرار پائے کہ اس کے سوا کچھ اور نہ ہو۔

''نَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي'' والے جملہ میں ''نفخ'' کا مطلب منہ یا کسی اور وسیلہ سے بدن کے اندر ہوا کا داخل کرنا کہلاتا ہے کہ جس کو لغوی معنی کہا جاتا ہے لیکن کنایہ کے طور پر اسے کسی چیز کی اثر گذاری یا غیر محسوس امر کا اس چیز میں استعمال کے لئے استفادہ کیا جاتا ہے اور آیہ شریفہ

---

[1] المیزان، ج:۲۰، ص:۲۲۲۔

[2] المیزان، ج:۱۵، ص:۲۶۔

[3] سورۂ حجر، آیت:۲۹۔

میں اس کا مقصد جسم انسانی میں روح کا پھونکنا ہے۔

البتہ یہ جو کہتے ہیں کہ انسان کے جسم میں روح کا ایجاد کرنا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ روح ایسی ہوا کہ مانند ہے جو کہ ہوا بھرے ہوئے جسم میں داخل کی گئی ہے بلکہ اس کا مطلب جسم اور روح کے درمیان تعلق اور رابطہ کا وجود میں لایا جانا ہے۔ جیسا کہ آیا ہے کہ ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ، انسانی روح وہی انسانی جسم ہے کہ جس نے دوسری خلقت کی شکل اختیار کر لی ہے بغیر کسی چیز کے اضافہ کے... اور ﴿يَتَوَفَّاكُم مَلَكُ الْمَوْتِ﴾[1]

اس میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوگی۔[2]

اور نفس اس جسم کی بہ نسبت جو کہ اس کی خلقت کے موقع پر اس کا منشأ آغاز تھا، درخت سے وجود میں آنے والے پھل یا چراغ کی روشنی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس بیان کے ذریعے روح سے بدن کے تعلق کی کیفیت اور بدن سے روح کی پیدائش کا ربط اور تعلق کسی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔[3]

یہاں پر ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ کا مطلب بہتر طور پر واضح ہوتا ہے بنابریں انسان کے مادی پہلو کے راستہ میں روح کا وجود عمل میں آتا ہے۔

''پھر اس نئی تخلیق (نفس یا روح انسانی) کا ایک طرح کا اتحاد و الحاق جسم کے ساتھ پایا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ وہ اپنے مقاصد کے حصول اور اس تک رسائی پانے کے لئے استعمال کر سکے۔ یہ ایک وسیلہ کی حیثیت سے اپنے مالک کے تحت اختیار قرار پاتا ہے جس طرح قلم، لکھنے والے کے لئے ضروری ہوا کرتا ہے اسی طرح انسان کا جسم بھی

---

[1] سورہ سجدہ، آیت: ۱۱۔

[2] المیزان، ج: ۱۲، ص: ۲۲۷، ۲۲۸۔

[3] المیزان، ج: ۱، ص: ۵۳۰۔

آدمی کی جان کے لئے وسیلہ ہوا کرتا ہے۔"[۱]

"درحقیقت یہی نفس انسانی (مَیں) ہے جس کے ذریعہ انسان کی انسانیت متحقق ہوتی ہے، اسی کے ذریعہ ارادہ وادراک عمل میں آتا ہے اور اسی کے ذریعہ انسانی اعمال انجام پاتے ہیں کہ جس کا وسیلہ وذریعہ بدن اور اعضائے انسانی ہوتے ہیں اور جسم انسانی اس نفس کے لئے ایک اوزار اور وسیلہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ البتہ نفس کے یہ وسائل مادی امور کے ساتھ ہی معنوی امور (مثال کے طور پر غور وفکر، حضور وشہود، مہر ومحبت اور قصد ونیت وغیرہ کرنے جیسے کام) بدن کی ضرورت ونیازمندی کے بغیر انجام دیا کرتے ہیں اور چوں کہ بدن اور نفس متحد ہیں اس لئے نفس کا نام بدن پر بھی صادق آتا ہے۔"[۲]

"موت آنے کے ساتھ ہی روح اور نفس کا رابطہ جسم انسانی سے منقطع ہوجاتا ہے اس کے بعد روح جسم سے مفارقت حاصل کرلیتی ہے اور اس کے ذریعہ کوئی کام انجام نہیں دیتی ہے۔"

بنابریں روح، جسم انسانی میں اول خلقت سے جب وہ گوشت ولوتھڑے کی شکل اور اس مرحلہ میں تھا اس وقت سے پوشیدہ اور موجود تھی پھر جسم کے نشوونما پانے کے بعد ظاہر اور مسلط ہوگئی اور اختتام پر جسم سے اس کے نکل جانے اور انسان کے مرجانے کے بعد آزاد اور مستقل ہوگئی۔[۳]

---

[۱] المیزان، ج:۱۵، ص:۲۶۔

[۲] المیزان، ج:۱۰، ص:۱۷۴۔

[۳] المیزان، ج:۱، ص:۵۳۰۔

انسان کا حقیقی تشخص

جب دنیاوی زندگی میں روح اور بدن کے رابطہ اور تعاون کا علم ہو گیا تو اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ انسان کا تشخص اور ماہیت کیا ہے؟ روح ہے یا وہی مادی جسم ہے جو کہ اپنی ظاہری شکل میں برقرار ہے؟

جن آیتوں میں موت کے بارے میں بیان ہوا ہے وہ اس سوال کا جواب بخوبی وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر معاد کا انکار کرنے والوں کے لئے خداوند عالم کا جواب بہت ہی عمدہ اور واضح ہے:

﴿وَقَالُوا أَئِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَئِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ بَلْ هُمْ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ كَافِرُونَ قُلْ يَتَوَفَّاكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَى رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ﴾[1]

کافروں نے کہا: کیا موت کے بعد جب خاک میں مل جائیں گے تو دوبارہ ہماری تخلیق عمل میں آئے گی؟ ان کے پاس اپنے کفر پر باقی رہنے کی کوئی دلیل نہیں ہے تاہم وہ اپنے پروردگار سے ملاقات پر کفر اختیار کرتے ہیں، اے نبی کہہ دیجئے! خدا کی جانب سے موت کے فرشتہ کو وکیل مقرر کیا گیا ہے تاکہ تمہیں مکمل طور پر اپنے تحت اختیار لیتے ہوئے تمہیں تمہارے پروردگار کے حضور پیش کریں!

''کلمۂ توفی'' کا مطلب کسی چیز کو مکمل طور پر دریافت کرنا ہے جیسے حق کا حصول یا کسی سے اپنے قرض کا مکمل طور پر حاصل کرنا وغیرہ....

....داوند عالم اپنے محترم نبی کو حکم دے رہا ہے کہ کافروں کو جواب میں بیان کر دیں کہ موت کی حقیقت انسان کا مکمل طور سے خاتمہ نہیں ہے اور تم لوگ مکمل طور سے مٹی میں معدوم نہیں ہونے والے ہو بلکہ موت کا فرشتہ مکمل طور پر اپنی تحویل میں لے لے گا اور تم سے کسی بھی چیز

---

[1] سورۂ سجدہ، آیت: ۱۰، ۱۱۔

کی کمی کے بغیر تمہاری روح کو تمہارے جسم سے باہر نکال لے گا۔ اس معنی میں کہ تمہارے جسم سے تمہاری وابستگی کو مکمل طور پر ختم کر دے گا۔

چوں کہ تمہاری ساری حقیقت تمہاری روح ہی ہے لہٰذا تم جو ساری زندگی کہتے رہے ہو کہ میں، تم، وہ... وغیرہ، مرنے کے بعد بھی زندہ اور محفوظ ہو اور تم سے کچھ کم ہونے والا نہیں ہے اور جو چیز تم سے کم ہو گی اور مٹی میں مل جانے والی ہے اور اس میں اول خلقت سے تبدیلی ہوتی آئی ہے وہ تمہارا جسم ہے کہ جس میں دگرگونی وجود میں آئے گی۔[1]

روح یا نفس کا غیر مادی ہونا

''کیا نفس یا دوسرے لفظوں میں انسانی روح مادہ سے خالی ایک وجود ہے؟ البتہ نفس سے مراد وہ حقیقت ہے کہ ہم میں سے ہر ایک بات کرنے کے وقت، مَیں، تم، وہ، فلاں وغیرہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔''

''مجرد نفس سے مراد یہ ہے کہ اس کو مادی وجود نہیں ہونا چاہیئے جو کہ قابل تقسیم بھی نہ ہو اور زمانہ اور جگہ کا بھی محتاج نہ ہو''۔

''اب جب کہ موضوع واضح ہو گیا اور یہ بات معلوم ہو گئی کہ کس چیز کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں تو یہ کہیں گے کہ ہم (خود اپنے اندر) ایسی حقیقت اور مطلب کو پاتے اور مشاہدہ کرتے ہیں کہ جس معنی اور حقیقت کی (میں) سے تعبیر کی جا سکتی ہے۔''

''یہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بات کو سمجھنے کے سلسلہ میں سبھی لوگ یکساں حیثیت رکھتے ہیں اور زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں اپنے شعور سے اس بات کو مٹا نہیں سکتے ہیں کیوں کہ جب تک ہمارا شعور کام کرتا ہے ہم متوجہ رہتے ہیں کہ یہ (میں) ہوں اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ہم خود کو بھلا بیٹھیں۔''

---

[1] المیزان، ج:۱۶، ص:۳۷۶، ۳۷۷۔

''اب دیکھنا یہ ہوگا کہ یہ (میں) ہمارے جسم کے کس حصہ میں واقع ہوا ہے اور اس نے خود کو کس نہاں خانے میں چھپا رکھا ہے؟''

''یقینی بات ہے کہ یہ ہمارے بدن کا حصہ نہیں ہے جو شخص زندگی بھر ''مَیں'' کہتا ہے وہ (مَیں) ہمارے سر کے اندر نہیں ہوتا، ہمارے دل، سینہ اور بدن کے کسی بھی حصہ میں نہیں ہوتا ہے اسی طرح ہمارے ظاہری حواس میں بھی اس کا وجود نہیں ہوتا (کیوں کہ ہم ان کو اپنی جانب منسوب کرتے ہیں) اور ان کے وجود کو ثابت کرتے ہیں (میری سماعت موجود ہے کیوں کہ میں ہوں اور میں سن رہا ہوں لہٰذا میری سماعت موجود ہے) اور ہمارے باطنی حواس (حافظہ و تخیل و فکر وغیرہ...) میں (کہ جس کو ہم تجربہ کے ذریعہ ثابت کرتے ہیں اور خود سے منسوب کرتے ہیں) موجود نہیں ہے۔''

اس کے مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:

۱۔ بارہا ایسا ہو چکا ہے اور ہوتا آیا ہے کہ میں اپنا جسم اور ظاہری و باطنی حواس رکھتے ہوئے بھی خود سے مکمل طور پر غافل ہو جاتا ہوں لیکن ایک لحہ کے لئے کبھی ایسا نہ ہوا کہ اپنی ہستی سے غافل ہو گیا ہوں اور میرا (میں) ہمیشہ ہی میرے سامنے حاضر رہتا ہے اس طرح سے معلوم ہوا کہ یہ (مَیں) جسم اور اعضائے جسمانی سے الگ ہے۔

۲۔ ''علاوہ ازایں اگر میرا بدن یا اس بدن کا کوئی حصہ (گرمی کی مانند) جسم کے خواص میں سے ایک خاصیت ہو اور اس بات کے پیش نظر کہ بدن اور اس کے تمام اعضاء اور اس کے آثار سبھی مادی ہیں اور قابل تبدیل ہیں نیز ان میں تقسیم و تجزیہ کی قابلیت پائی جاتی ہے لہٰذا (میں) کو بھی قابل تبدیل و تقسیم ہونا چاہیے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔''

''اس بنیاد پر کہ جو کوئی اپنے ادراک اور مشاہدہ کی جانب (جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا کہ کبھی بھی اس سے غافل نہیں ہوتا) رجوع کرے اور برسوں پہلے کہ جب اس نے اپنے دائیں بائیں کو پہچانا اور خود کو دوسروں سے متمایز کیا، یاد کرے اور خاطر میں لائے تو دیکھے اور محسوس کرے گا کہ کل والا ''میں'' اور آج والا ''مَیں'' ایک ہی ''مَیں'' ہے اور اس میں کوئی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوئی ہے۔''[1]

البتہ اس عدم دگرگونی وتبدیلی کا یہ مطلب ہے کہ جسم کے اندر مردہ خلیوں اور ذرات کی جگہ زندہ خلیوں اور ذرات نے لے لی ہو یا ان میں نئی جان اور روح پھونک دی گئی ہو کیوں کہ (مَیں) میں بھی کچھ تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں جیسے کہ اس کے علم وارادہ اور طاقت میں اضافہ ہونا جو کہ خود نفس میں تبدیلی کا باعث وموجب نہیں ہوتا بلکہ اس کے اوصاف ہیں جو تبدیل ہوا کرتے ہیں کہ جن پر گہری توجہ مبذول کی جائے تو پتہ چل جائے گا کہ یہ اوصاف واحوال نفس میں دگرگونی وتبدیلی کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جس کو حرکت جوہری کا نام دیا جاتا ہے لیکن باجود اس کے کہ نفس میں اتنا ارتقاء واقع ہو چکا ہے پھر بھی اس کی اصلیت وہی ہے اور اس بابت اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔

لیکن نفس اپنی پائیداری وثبوت کے ساتھ ہمیشہ باقی ہے اور باقی رہے گا موت کے بعد بھی ہمیشہ آدمی کے ساتھ موجود ہوگا اور بنیادی طور پر انسان جب تک کہ ہے اس کا نفس اس کے ساتھ جوں کا توں باقی رہے گا لیکن اس کا بدن اور بدن کے تمام اعضاء وجوارح اور ان کے خواص ہر لحاظ سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور یہ تبدیلی مادّہ اور شکل وصورت نیز دیگر احوال وآثار کے تحت واقع ہوتی رہتی ہے، بنابریں یہ واضح ہوا کہ (مَیں) کا وجود جسم سے الگ ہے اور بدن کا آدھا حصہ کسی حادثہ کی بنا پر قطع بھی ہو جائے تو نفس منقطع اور دو ٹکڑے نہیں ہوا کرتا بلکہ حادثے سے پہلے والا

---

[1] المیزان، ج:۱، ص:۵۴۹، ۵۵۰۔

مکمل شخص کہلائے گا۔

۳۔ اسی طرح اگر ان دو مشاہدات کو ایک ساتھ پرکھا جائے تو نظر آئے گا کہ (میں) کا مطلب و مفہوم بہت وسیع اور متحد ہے کہ جس کو بانٹا اور ٹکڑے نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن جسم قابل تقسیم ہوتا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ نفس بدن سے الگ چیز ہے، بنابریں نفس بدن کا حصہ یا اس کی خاصیت اور خواص کا حصہ نہیں ہوسکتا ہے کیوں کہ یہ سب مادی ہے اور مادہ تبدیلی کی حالت میں ہوا کرتا ہے جو کہ تقسیم کے قابل ہے، اس لئے نفس کسی بھی حالت میں مادّی نہیں ہوسکتا ہے۔

''ہم جس حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ واحد و بسیط امر ہے کہ جس میں کثرت اور اجزاء اور مخلوط کا وجود نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف واحد ہے، ہر شخص اپنے اندر اس بات کو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے کہ وہ خود ہی ہے اور اس کے سوا کوئی اور نہیں ہے اور وہ دو آدمی نہیں بلکہ فرد واحد ہوتا ہے، اس کے دو جزء نہیں ہیں بلکہ وہ منفرد حقیقت ہے۔''

اس طرح معلوم ہوا کہ یہ مشہور امر، ایک مستقل امر ہے کہ جس پر مادہ کی حد کا انطباق نہیں ہوتا اور نہ ہی اس پر صادق آتا ہے اور اس کے اندر احکام اور مادہ کے احوال کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا، بنابریں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ جوہر سے منفرد ایک مادہ ہے کہ جس کا تعلق اس کے مادی بدن سے ہے جو کہ اس کو بدن سے متحد کرتا ہے یعنی ایک ایسا تدبیری تعلق جو بدن کو تدبیر پر اکساتا اور مجبور کرتا ہے نیز بدن کو کام کرنے سے نہیں روکتا ہے اور نہ ہی اس کو غیر منظم طور پر کام کرنے دیتا ہے۔''[1]

---

[1] المیزان، ج:۱، ص:۵۵۰ اور ۵۵۱۔

قرآن میں روح کا مفہوم

﴿یَسۡئَلُوۡنَکَ عَنِ الرُّوۡحِ﴾[1]

''جیسا کہ لغت میں تعارف کرایا گیا ہے کہ کلمہ روح حیات کے مبدأ کے معنیٰ میں ہے کہ جس کے ذریعہ ہر جاندار اپنے ارادی احساس وادراک پر قادر ہوتا ہے''۔[2]

''خداوند عالم نے جہاں انسانی تخلیق کی (انسان کے عنوان سے) بات کی ہے وہاں اس مبدأ کو روح یا بعض مواقع پر نفس سے متعارف کرایا ہے۔''[3]

''ممکن ہے کہ اس کلمہ کا مجازی استعمال، ان امور میں (کہ جن کے ذریعہ اس کے آثار نیک ومطلوب ظاہر ہوں) اسی طرح جائز ہو جس طرح کہ علم کو نفوس کے لئے حیات کہا جاتا ہے اور خداوند عالم نے فرمایا ہے:

﴿اَوَمَنۡ کَانَ مَیۡتًا فَاَحۡیَیۡنٰاہُ﴾[4]

زندہ کرنے سے مراد ایمان کی جانب ہدایت کرنا ہے۔

اس آیۂ شریفہ، ﴿یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَةَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ﴾ میں بھی بعض علماء نے روح کی تعبیر وحی سے کی ہے اور اسی طرح ''وَ کَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَا اِلَیۡکَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا'' میں اس سے مراد قرآن ہے یعنی وحی اور کہا جاتا ہے کہ اگر خدا نے قرآن ووحی کو روح قرار دیا ہے تو وجہ یہ تھی کہ اس کے ذریعہ مردہ نفوس کو نئی زندگی ملتی ہے جس طرح کہ روح مردہ جسموں کے لئے حیات کا باعث ہوتی ہے۔[5]

---

[1] سورۂ اسراء، آیت: ۸۵۔

[2] المیزان، ج: ۱۳، ص: ۲۷۰۔

[3] المیزان، ج: ۲۰، ص: ۲۲۱۔

[4] سورۂ انعام، آیت: ۱۲۲۔

[5] سورۂ نحل، آیت: ۲۔

''بہت سی مکی و مدنی آیتوں میں کلمۂ روح کی بارہا تکرار ہوئی ہے اور سبھی جگہوں پر اس معنی میں کہ جیسا جانداروں میں پاتے ہیں اور مبداء حیات واحساس کا منشاء اور ارادی حرکت کے سلسلہ میں استعمال میں ہے استعمال نہیں کیا گیا ہے، جیسے اس آیت ﴿يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ﴾ میں اور اس آیت ﴿تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ﴾[1]

بے شک ان دو آیتوں میں روح سے مراد غیر حیوانی اور غیر ملائکہ کی روح مراد ہے۔

المیز ان، ج: ۱۳، ص: ۲۰۷۔

نفس کے مفہوم میں غلط فہمی

جیسا کہ تاریخ میں نشاندہی کی گئی ہے کہ پہلے زمانے کے لوگوں نے بھی خود کے لفظ کا استعمال کیا ہے لیکن چوں کہ وہ لوگ مادی تھے اور ان کی نظر ورائے خودخواہی وخودغرضی پر مبنی تھی اور وہ صرف اپنی جسمانی ضروریات کے خواہاں تھے اس لئے اس لفظ کی معنویت اور حقیقت پر توجہ نہیں دی اور گہرائی سے غور وفکر کو ضروری نہیں سمجھا اور بسا اوقات انہوں نے اسی غفلت اور عدم توجہ کی وجہ سے معنوی کلمہ کو مادی وجسمانی عنصر وکا جز وسمجھ لیا۔

لہٰذا یہ گمان کرلیا کہ ظاہری عبارت کے مطابق زندہ اور مردہ کے درمیان اور حد فاصل وہی نفس ہے کہ جس کا زندہ انسان نے زندگی بھر دم بھرا اور نفس کے ذریعہ سانسیں لیں، اس لحاظ سے زندہ جسم کو ایسا جسم قرار دیا گیا اور مانا گیا ہے کہ جس کے تحت نظام تنفس کی کارکردگی جاری رہتی ہے اور جس جسم کے اندر یہ نظام نہ پایا جاتا ہو یا نظام تنفّسی کے فقدان کے باعث وہ ناکارہ ہو چکا ہو، اسے مردہ جسم قرار دیا جاتا ہے کہ یہ مردہ کچھ نہیں محسوس کرتا اور مکمل طور پر اس کے وجود کے آثار باطل اور اس کی حقیقت وشخصیت یکسر طور پر معدوم ہوکر رہ جاتی ہے۔

''چوں کہ وہ لوگ اس طرح خیال کرتے تھے لہٰذا تدریجی طور پر ان کی نظروں میں یہ

---

[1] سورۂ قدر، آیت: ۴۔

بات مسلم ہوگئی کہ (میں یا خود) وہی نفس اور وہی مخصوص نفسانی خواہش ہے اسی لئے اس خواہش کا نام روح رکھ دیا اور اس طرح حکم لگایا ہے کہ انسان جسم و روح یعنی خواہشات وجسم کا مجموعہ ہے۔''

''یا یہ کہ انہوں نے یہ خیال کرلیا کہ جسم کا زندہ رہنا اور تن بدن کا حرکت کرنا اور اس میں حس کی موجودگی اس خون کی وجہ سے ہے جو رگوں کے ذریعہ جسم میں دوڑتا رہتا ہے اور جو حیات یا زندگی کے ختم ہوجانے یا رک جانے کی وجہ سے ختم ہوجاتا ہے، اس کا وجود یا عدم وجو اسی ارغوانی رنگ کی وجہ سے ہے اس لئے یہ حکم کیا کہ یہ نفس جو کہ میرا ہے وہی خون ہے، بلکہ انہوں نے خون کو نفس مانا ہے اور اس کو دو قسموں میں ایک سیال یا جہندہ یعنی اچھل کر نکلنے والے اور دوسرے غیر سیال یا غیر جہندہ یعنی اچھل کر نہ نکلنے والے خون میں تقسیم کردیا ہے۔''[1]

علم وانحراف

''مادیت پسند اہل دانش اور بعض علمائے الٰہیات و متکلمین نیز ظاہر پسند علماء یعنی اہل حدیث کے بعض علماء، تجرد روح کی منکر ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنے دعوے کے ثبوت اور ہماری دلیلوں کے انکار میں کچھ ایسی دلیلوں کو پیش کرنا شروع کردیا ہے جو کہ بے سود کوشش اور تکلف سے خالی نہیں ہیں:

۱۔ مادہ پرستوں نے کہا: مختلف علوم کے شعبوں میں اس قدر ترقی و پیشرفت اور آج کے دور میں اس حد تک رسائی نیز گہری چھان بین کے باوجود، انسان کی جسمانی خاصیتوں میں سے کچھ کا بھی پتہ لگانے میں کامیابی حاصل نہیں کی ہے مگر یہ کہ اس کے جوانب میں مادی وجوہات کا ضرور انکشاف ہوا ہے۔ اب کوئی ایسی خصوصیت نہیں رہ

---

[1] المیزان، ج:۶، ص:۲۶۲، ۲۶۳۔

گئی ہے جو بغیر کسی علت کے رہ گئی ہو کہ جس کی وجہ سے یہ اظہار کیا جا سکے کہ مادہ سے الگ ہٹ کر صرف روح کا اثر ہے کیوں کہ یہ مادہ سے مطابقت رکھنے والے قوانین میں سے نہیں ہے تا کہ اسے مجرد روح کے وجود کی دلیل قرار دیا جا سکے۔

''انہوں نے اپنے عقیدے اور نظریہ کی وضاحت میں کہا ہے کہ اعصابی تسلسل جو پورے جسم اور اس کے اعضاء پر محیط ہے وہ تمام جسمانی اعضاء کی حس کو اپنے وجود میں لے کر اعصاب کے مرکز میں بڑی تیزی کے ساتھ تمام ادراکات کو منتقل کرتا ہے اور اس مرکز کی جگہ دماغ کا ایک معین حصہ ہے جو کہ متحدہ مجموعہ ہے کہ جس کے حصے ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں اور اگر ان میں سے کچھ باطل ہو جائے یا ناکارہ ہو جائے اور دوسرے حصہ اس کی جگہ لے لیں تو یہ تبدیلیاں سمجھ میں آنے والی نہیں ہیں اور یہ متحدہ مرکز و نظام وہی نفس ہے جو کہ ہمیشہ ہی ہمارے سامنے حاضر و موجود رہتا ہے اور ہم اسے ''مَیں'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

''لہٰذا یہ جو ہم احساس کرتے ہیں کہ ہم'' بغیر کسی سر اور پیکر کے ہیں یہ صحیح ہے لیکن صرف اس احساس کا وجود اس بات کا باعث نہیں ہوتا ہے کہ یہ کہیں کہ بنابریں ''ہم'' اپنے وجودی پیکر اور جسمانی خاصیتوں کے بغیر ہی وجود رکھتے ہیں، بلکہ جہاں تک کہ اعصاب کا مرکز ایک ایسا مجموعہ ہے کہ جس میں ادراکات کا دوام اور تسلسل بہت تیزی کے ساتھ انجام پاتا ہے اس لئے ہم کسی بھی لحہ اس سے غافل نہیں رہتے ہیں۔

''کیوں کہ اس سے غفلت کا لازمہ جو کہ اپنی جگہ پر مسلم ہو چکا ہے اعصاب کا بطلان اور عمل سے اعصابی نظام کا ٹوٹ جانا اور رک جانا ہے یعنی موت کا واقع ہو جانا ہے۔''

یہ سچ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ نفس (یعنی میں) ہمیشہ ثابت و استوار رہا کرتا ہے لیکن یہ ہماری حس ہے کہ (آگ کے گول دائرے کی مانند گھومتا ہوا دیکھنے کی طرح) جہاں اپنے ادراک کی تیزی اور ارادہ کی سرعت کی بنا پر ہم آگ کو گھومتے ہوئے آگ کے گولے یا دائرے کی

طرح خیال کرتے ہیں نہ کہ جلے ہوئے کوئلہ کی طرح یا حوض کی مانند خیال کرتے ہیں کہ جہاں ایک طرف سے نہر کا پانی اس کے اندر آتا ہے اور دوسری طرف سے خارج ہو جاتا ہے، ایسی حالت میں ہمیں ایسا لگتا ہے کہ یہ حوض کا پانی ہمیشہ ثابت و استوار ہے اور جب اس پانی میں انسان کا یا درخت یا کسی اور چیز کا سایہ پڑتا ہے تو وہ بھی ثابت و استوار ہی نظر آتا ہے۔

''جیسا کہ حوض کی مثال میں ہم اس کے پانی کو ثابت و استوار تصور کرتے ہیں اور واحد محسوس کرتے ہیں حالانکہ نہ تو وہ واحد ہے اور نہ ہی ثابت و استوار بلکہ وہ متعدد بھی ہے اور متغیر بھی اسی طرح آدمی کا نفس بھی باوجود اس کے کہ واحد و ثابت اور انفرادی نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں نہ تو وہ واحد ہے نہ ہی ثابت اور نہ ہی کسی شخصیت کا مالک ہے۔''

''نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس نفس کو باطنی مشاہدہ پر مبنی دلیل کے تحت تجرد قرار دیا گیا ہے وہ در حقیقت مجرد و منفرد نہیں ہے بلکہ فطری و طبیعی خواص کا ایک مجموعہ ہے کہ جس کے عصبی ادراک نیز تاثیر و تاثر کا نتیجہ ہے کہ جس کے بیرونی مادی اجزاء اور عصبی ترکیبی اجزاء ایک دوسرے میں شامل ہیں اور نفس سے متعلق وہ وحدت جو نفس سے مشاہدہ ہوتی ہے، اجتماعی وحدت ہے نہ کہ حقیقی اور واقعی وحدت ہے۔''[1]

دوسرے لفظوں میں یہ کہ نفس کے عنوان سے جس چیز کا ہم احساس کرتے ہیں اور وہ ایک سے زیادہ نہیں نظر آتا ہے وہ ہمارے اعصاب کے مجموعی ادراک اور سسٹم کی پیداوار ہے جو کہ بے شمار حصوں سے تشکیل پایا ہے، علامہ طباطبائی نفس کے مفہوم کے بارے میں پائی جانے والی اس غلط فرز فکر کے جواب میں فرماتے ہیں: اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ (مختلف علوم جو کہ اس قدر ترقی و پیش رفت حاصل کر چکے ہیں اور ان سب کے باوجود اپنی جستجو میں انہیں جسم کی کسی بھی خاصیت کا پتہ لگانے میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے مگر یہ کہ انہوں نے اس کے ساتھ اس کی

---

[1] المیزان، ج:۱،ص:۵۵۱، ۵۵۲۔

مادی وجوہات کا سراغ لگانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے کہ جسم کی کوئی بھی خاصیت ایسی نہیں ہے کہ جس میں مادی علت کا وجود نہ ہو کہ جس کی بابت یہ کہا جا سکے کہ روح کا یہ اثر مادہ سے الگ اور خالی ہے)

''لیکن یہ قول نفس کے مادہ سے خالی و منفرد ہونے کی برحق دلیل نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس کے وجود پر برہان قائم ہو چکا ہے کیوں کہ فطری اور سائنسی علوم جن کی مادہ و فطرت کے دائرہ اور حدود میں ہی جولانی ہے اور وہ صرف اپنے مادی و فطری دائرے میں ہی اپنی سرگرمیاں انجام دینے کا حق رکھتا ہے مثال کے طور پر سائنس اپنے موضوع (مادہ) کے خواص کی جستجو کرے اور اپنی نوعیت کے احکام کو کشف کر کے مورد استفادہ قرار دے یا وہ اپنے تجربات کی تکمیل کے لئے استعمال کرنے والے مادی آلات و وسائل کے خواص کو بیان کرے لیکن یہ کہ اس حد اور دائرے میں کیا ہو رہا ہے اور حقیقت میں کوئی ایسی چیز ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو اس کے آثار کیا ہیں؟ تجربی علوم اور سائنس اس سلسلہ میں اپنی رائے ظاہر کرنے سے قاصر ہیں اور یہ اظہار نظر نہ تو نفی میں ہو سکتا ہے اور نہ ہی اثبات میں!

کیوں کہ یہ علوم تجربی زیادہ سے زیادہ اپنے دائرے سے نکل کر مادی علوم کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے اس دیوار کے پیچھے کچھ نہیں دیکھا اور یہ بات صحیح بھی ہوگی کیونکہ دیکھنا بھی نہیں چاہیے، لیکن یہ نہ دیکھنا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے (اسی وجہ سے اگر مادی علوم اپنی موجودہ میزان سے ہزار گنا کیوں نہ بڑھ جائیں پھر بھی وہ مادی دائرے میں محدود و محصور ہیں) اور اس دائرے کے اندر کوئی بھی غیر مادی موجود اور اس کی صنف سے الگ کوئی چیز اور فطری حکم نہیں پایا جاتا کہ وہ اسے دیکھ سکے۔''

''اگر مادہ پرستوں نے اپنے دائرۂ اختیار سے باہر نکل کر بہ آسانی مجردات کا انکار کر کے اپنی ہمت کو مہمیز کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے یہ خیال کر لیا کہ نفس کے تجرد

کو ثابت کرنے والوں نے نادانی میں آکر ایسا کام کیا ہے کہ جس کی وجہ سے زندگی کے آثار کو جو کہ درحقیقت اعضائے بدن کا مادی فریضہ ہے، اس سے سامنا ہوا ہے اور چوں کہ اس کا جواز علمی قواعد کے ذریعہ پیش نہیں کر سکے اس لئے مجبور ہو کر اس کی نسبت مافوق مادہ سے دے دی اور اس انفرادی مجرد موجود کو اپنے لئے پریشانی کا حل قرار دے دیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ جواز انہی دنوں کے لئے مفید تھا جب علم، مادی علتوں کے خواص اور آثار کے بیان سے عاجز و ناتواں تھا لیکن آج جب کہ علم نے فطری علل و اسباب کا سراغ لگالیا ہے تو اس کی چنداں اہمیت و افادیت نہیں رہ جاتی ہے، اسی طرح کا خیال خالق ہستی کے اثبات کے بارے میں بھی کیا گیا ہے لیکن یہ خیال باطل ہے کیوں کہ تجرّدِ نفس کے قائل لوگوں نے اس کو اس ذریعہ سے ثابت نہیں کیا ہے اور ایسا نہیں تھا کہ جسمانی آثار و افعال کو کہ جس کی علت آشکار تھی بدن سے نسبت دیں اور اس وجہ سے کہ اس کی مادی وجہ کا پتہ نہ لگا سکے تھے، مجرد نفس سے استناد و اثبات کریں بلکہ مجموعی اور مکمل طور سے جسمانی خواص کو جسمانی علتوں سے منسوب کریں۔''

''لیکن جو چیز واضح ہے یہ ہے کہ زندہ جسم کے آثار کو جسم سے نسبت دی جاتی ہے جو بغیر کسی واسطہ کے ہوتی ہے اور اس کو نفس سے بھی نسبت دی جاتی ہے کہ جس کا واسطہ نفس سے ہوتا ہے اور جن آثار کی براہ راست طور پر نفس سے نسبت دیتے ہیں کہ جنہیں نفس سے منسوب نہیں کیا جاسکتا ہے جیسا کہ آدمی کو خود اس کے علم سے نسبت دینا اور یہ کہ وہ ہمیشہ ہی خود کو دیکھتا ہے کہ جس کا بیان گذر چکا ہے۔

''مثال کے طور پر انگلیوں کی حرکت، نسوں، خلیوں اور اعصابی حرکات سے مربوط ہے تاہم جس سے حاصل ہونے والے انسانوں کے ارادے اور فیصلہ سے بھی مربوط ہے'' لیکن یہ جو کہا گیا ہے کہ (اعصاب کا مرکز ایک ایسا مجموعہ ہے کہ جس کے اندر ادراکات بڑی تیزی کے ساتھ

انجام پاتے ہیں اس لئے ایک لحہ بھی اس سے غافل نہیں رہتے ہیں) اس بات کا صحیح مطلب نہیں نکلتا ہے اور اپنے نفس سے متعلق جو شہود ہمارے پاس ہیں وہ ان سے بالکل ہی مطابقت نہیں رکھتے ہیں۔)

''اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے لوگوں نے اپنے شہود سے تغافل برتا اور بات کو کہیں سے کہیں لے کر گئے یعنی بات کو اور اس کے موضوع کو نفس سے ہٹا کر فکری اور حسّی اپج تک لے گئے کہ جس کا سلسلہ دماغ سے جا کر ملتا ہے اور اس کے توالی وتوارد کی بحث میں مشغول ہو جاتے ہیں، ہمیں اس بات کا اندازہ نہیں ہو پاتا کہ ہم جس چیز کو ثابت کرتے ہیں اور وہ لوگ جس بات کی نفی کرنا چاہتے ہیں، ان دونوں کا آپس میں ربط کیا ہے؟ اگر اس سلسلہ میں بہت زیادہ امور کو فرض کریں جب کہ ایسا ہی ہو تو یہ بہت سارے امور ایک متحدہ مجموعہ کو کس طرح سے تشکیل دے سکتے ہیں کہ جنہیں (میں اور تم) کا نام دیا جا سکتا ہے؟

''اس کے علاوہ ایسے بہت سے امور ہیں کہ جو اعصابی مرکز میں ادراک وارادے کے عنوان سے پائے جاتے ہیں یہ سبھی مادی امور ہیں اور ان کے علاوہ اور ان سے الگ کچھ اور نہیں ہیں اور (ہماری) واحد و یگانہ شخصیت وتشخص جو کہ ہمیشہ ہی ہمارے سامنے حاضر وموجود اور قابل مشہود ہے، ہو سکتا ہے کہ بہت زیادہ مقدار میں پائے جانے والے ادراکات ہی ہوں، تو پھر ہم انہیں زیادہ حد تک کیوں نہیں دیکھتے ہیں اور کیوں صرف (مَیں) والے واحد امر کا ہی مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی اور چیز کو نہیں دیکھتے ہیں؟''

یہ اتحاد ویگانگت جو ہمیں حاصل ہوئی ہے اور مشہود ہے، وہ کہاں سے آئی ہے؟[1]

اگر یہاں پر گھومتے ہوئے آگ کے گولے کی مثال لائیں تو اس کے سلسلہ میں یہ کہا

---

[1] المیزان، ج:۱، ص: ۳۵۲ تا ۳۵۴۔

جاسکتا ہے کہ اس گھومتے ہوئے گولے اور دائرے کا ایک اثر یہ ہے کہ حالت گردش میں یہ یکساں اور واحد نظر آتا ہے لیکن اعصابی ادراکات کبھی شنید کے قابل ہوتے ہیں تو کبھی دید کے قابل لمس و محسوس کئے جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے اپنے اپنے ادراکات و احساسات اور خاص نوعیات و کیفیات اور قوانین ہوتے ہیں۔

کبھی وہ آسمان کی نیلگونی کو دیکھتا ہے تو اس کو وسیع اور پھیلا ہوا پاتا ہے اور خداوند عالم کو اس کا پیدا کرنے والا، کبھی اسی آسمان میں خروش ونا ہم رنگی اور نیلگونی کو سیاہی میں تبدیل ہوتا ہوا پاتا ہے اور انسان کو اس کا پیدا کرنے والا۔ اگر ان ادراکات سے الگ ہٹ کر جو کہ گونا گونی پر محیط ہیں، واحد ادراک کرنے والا نہ ہو تو نہ تو یہ ادراکات شکل وصورت اختیار کر سکتے ہیں اور نہ ہی ماہیت و تشخص بصورت منفرد و واحد مشہود ہو سکتے ہیں، اس سلسلہ میں علامہ طباطبائیؒ مادی دانشوروں سے مفصل بحث کرتے ہیں کہ جس کا خلاصہ ہم پیش کرتے ہیں:

مادیت پسندوں نے کہا کہ شخصیت کی وحدت ایک اجتماعی وحدت ہے کہ جو ہمارے ادراکات کے اجتماع سے حاصل ہوتی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اجتماعی وحدت میں اصل کثرت ہے اور وحدت اس کا ماحصل و ماخوذ از کثرت ہے اس گھر کی مانند جو کہ مختلف اجزاء سے تشکیل پایا ہے تاہم اس گھر کی ماہیت ان اجزائے کثیر کی یگانگی کے اعتبار کا حصہ ہے۔ اگر ہماری شخصیت اس طرح کی ہو تو (مَیں) کے عنوان سے جس چیز کو ہم پہچانتے ہیں وہ اعتباری ہوگی اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے جب کہ جو کچھ ہم اپنے بارے میں درک کرتے ہیں وہ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اگر میری (مَیں والی) شخصیت اور ماہیت، بہت سے ادراکات کے حصول کے یگانہ نتیجے کی حیثیت رکھتی ہے تو کیا یہ ادراکات ومحسوسات از خود ہی اس طرح کا نتیجہ اخذ کرتے ہیں یا ان سے مافوق درک کرنے والی نفس نامی کوئی دوسری بڑی طاقت بھی موجود ہے:

''جیسا کہ تاریخ بشری سے نشاندہی ہوتی ہے، لوگوں کی زبان پر چاہے وہ ابتدائی دور

کے ہی لوگ کیوں نہ ہوں، ان کی گفتگو کے دوران بھی (میں اور خود) جیسے الفاظ جاری رہا کرتے تھے اور یہ طے بات ہے کہ وہ لوگ اس جملہ اور کلمہ سے اس دنیا سے الگ کسی خارجی حقیقت کو سمجھتے تھے اور یقیناً وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔''[1]

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ہماری حس ہے جو وارد ہونے والے ادراکات کی سرعت کی وجہ سے غلطیوں کا ارتکاب کر بیٹھتی ہے اور کثیر کو واحد، متغیر کو ثابت اور تجزیہ ہونے والے کو بسیط اور متحد تصور کر لیتی ہے۔

''اس عقیدہ کی غلطی آشکار ہے کیوں کہ غلطی کا ارتکاب بذات خود ایک حقیقت ہے مثال کے طور پر گھومتے ہوئے آگ کے دائرے کو دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ گھومتا ہوا آگ کا گولہ آگ کو اس شکل میں بدل دیتا ہے، پھر بھی اس کو پہلے جیسا دیکھتے ہیں، یا اس ستارے کو جس کو چھوٹے ستارے کی مانند دیکھتے ہیں، حقیقت میں یہ دیکھتے ہیں کہ یہ کس قدر بڑا ہے اور جب پھر اس کو اسی چھوٹی حالت میں دیکھتے ہیں تو سمجھ میں آتا ہے کہ یہ غلطی ایک نسبی امر ہے اور جب ستارے کو اپنے علم و دانش کے ذریعہ اس کا حقیقی اندازہ و موازنہ کرتے ہیں تو احساس کرتے ہیں کہ اس کو چھوٹا دیکھنے کا احساس غلط تھا۔''

لیکن ہمیں اپنی بحث میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہم خود یہ بات جانتے ہیں کہ یہ ادراک اور ان کی یگانگت کا تجزیہ پذیر نہ ہونا اور نفس کی عدم تبدیلی کا مؤثر نہ ہونا کوئی جھوٹ یا غلطی نہیں ہے اور انہیں کسی بھی آزمائش و امتحان میں ان کی اقسام و گوناگونی اور تجزیہ و تغییر کو قابل تقسیم و تجزیہ نہیں بنایا جاسکتا ہے تو پھر ہمارا یہ نہ معلوم ہونے والا (مَیں) کیا ہے؟ یہ مادی تو نہیں ہوسکتا کیوں کہ اس میں کوئی بھی مادی اوصاف و خواص اور ظاہری احوال و آثار نہیں پائے جاتے ہیں۔

جو لوگ نفس اور انسانی ماہیت اور نفس کو سرعت و کثرت واردات کی پیداوار سمجھتے ہیں وہ

---

[1] المیزان، ج:۶، ص:۲۶۲۔

اپنے فریضہ کے لئے کوئی دلیل نہیں پیش کر سکے ہیں کہ جس سے یہ پتہ چل سکے کہ (مَیں) کی حقیقت حسی و مادی کثرت پر مبنی ادراکات ہیں۔ مختصر یہ کہ مادی علم مافوق مادّہ کا سراغ نہیں لگا سکتا ہے اور اس کا عدم حصول اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔[1]

نفسیاتی لحاظ سے نفس یا روح کا تجزیہ

لیکن دور حاضر و عصر جدید کے ماہرین نفسیات نے تجرد نفس کی نفی و انکار کے سلسلہ میں جو چیز فرض کی ہے وہ یہ ہے کہ نفس ایک ایسی متحد حالت کا نام ہے جو کہ نفسیاتی حالات و روحی اثرات سے وجود میں آتی ہے، جس طرح سے انسان بدن کے ذریعہ ادراک کا حامل ہے، ارادے کا بھی مالک ہے، وہ خوشنودی و محبت اور کراہت و بغض کا بھی احساس رکھنے کے ساتھ اس طرح کے بہت سے حالات و تاثرات کا مالک ہے اور جب یہ سب ایک ساتھ مل جاتے ہیں تو یہ اُس کو، اور وہ اِس کو تعدیل یا تبدیل کر دیتے ہیں اور مختصراً یہ کہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں جس کے نتیجہ میں ایسی متحدہ حالت وجود میں آتی ہے کہ ہم جس کو (مَیں) سے تعبیر کرتے ہیں۔

ہم ان لوگوں کے جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس بارے میں ہماری بحث نہیں تھی اور ہمیں یہ حق بھی نہیں ہے کہ آپ لوگوں کے فرضیات اور نظریات کی روک تھام کریں کیوں کہ ہر صاحب علم اپنے فریضہ کو پیش کرنے کا حق رکھتا ہے اور اسے اپنے دانش و علم کی بنیاد بنانے اور قرار دینے کا حق رکھتا ہے اور اسی طرح اگر اس نے اس بنیاد پر اپنی دیوار بلند کی اور اس کی درستی پر ایمان لایا تو ٹھیک ہے لیکن اگر اس فریضہ کی دیوار گر گئی تو دوسرا فریضہ قرار دینے کا حق رکھتا ہے۔

ہماری گفتگو ایک خارجی اور حقیقی مسئلہ پر تھی کہ جس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ ہے یا نہیں ہے، نہ یہ کہ کوئی ایک اس کے وجود کو فرض کرے اور دوسرا اس کے نہ ہونے کو فرض کرے۔ ہماری بحث فلسفی ہے کہ جس کا موضوع ہستی ہے اور ہم انسان کے بارے میں بحث کر رہے ہیں کہ

---

[1] المیزان، ج:۱، ص: ۵۵۴، ۵۵۵۔

کیا انسان کی تمام ہستی بس یہی اس کا مادی جسم ہے یا مادہ سے الگ بھی کچھ اور ہے"۔[1]

یہ بحث نہیں ہے کہ اس کے آثار کیا ہیں اور ان آثار کے دیگر چیزوں پر اثرات کیا پڑتے ہیں کہ کوئی آکر یہ کہے کہ نفس نام کی کوئی چیز نہیں ہے اور یہ آثار الگ سے کسی چیز پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

فطرت پسندی کی غلطی

"تجرد نفس (انفرادیت) کے منکر کچھ لوگوں نے (البتہ یہ وہ لوگ ہیں جو مبدأ و معاد کے قائل ہیں) اپنے انکار کے جواز میں کہا ہے کہ علوم کے ذریعہ انسانی زندگی کے بارے میں جو شناخت عمل میں آئی ہے، وہ کچھ خلیے ہیں جو انسانوں اور جانوروں دونوں میں بالطبع پائے جاتے ہیں کہ جن کے ذریعہ حیات انسانی کا وجود میسر و مقدور ہوتا ہے لہٰذا ان خلیوں میں روح ایک خاص قسم کی خاصیت اور اثر رکھتی ہے۔"

"دلچسپ بات یہ ہے کہ ان خلیوں میں متعدد قسم کی روحیں پائی جاتی ہیں، لہٰذا جو حقیقت انسان کے اندر موجود ہے اور جس کو ہم لوگ (مَیں) سے جانتے اور پکارتے ہیں وہ بے شمار اور ان گنت روحوں کا مجموعہ ہے کہ جو متحدہ اور اجتماعی طور پر موجود ہو گئے ہیں اور معلوم ہے کہ زندگی کی یہ کیفیتیں اور روح کی یہ خصوصیتیں، انسان کی موت یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ خلیوں کے مرجانے کے بعد سب ختم ہو جاتی ہیں اور پھر انسان نام کی کوئی چیز نہیں رہ جاتی ہے۔"

"بنابریں، پھر کوئی مطلب نہیں رہ جاتا کہ ہم یہ کہیں جسم کے ختم ہو جانے اور فنا ہو جانے کے بعد، اس کی ترکیب یعنی منفرد و مجرد روح اس کے اندر باقی رہ جاتی ہے اور جن خلیوں اور ذرات کو علم کی پیشرفت کے ذریعہ کشف کیا گیا ہے وہ زندگی کے راز سے

---

[1] المیزان، ج:۱، ص:۵۵۶۔

پردہ اٹھانے کے لئے کافی نہیں ہیں لہٰذا اس کے سوائے اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ یہ کہیں کہ فطری علل واسباب روح وزندگی کی تشکیل عمل میں نہیں لا سکتے ہیں، مثال کے طور پر مردہ مٹی سے کسی زندہ وجود کو لا کر کھڑا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے فی الحال زندگی کے معرض وجود میں آنے کو دیگر معلول یعنی مافوق فطرت موجود کو قرار دینا چاہیئے"۔

"لیکن عقلی لحاظ سے نفس کے تجرد پر مبنی استدلال کو کسی علمی شاہد کے پیش کئے بغیر یہ استدلال غیر قابل قبول ہے کہ جس کو آج کا علم قبول کرنا اور اس کے آگے سر تسلیم خم کرنا نہیں چاہتا ہے کیوں کہ آج کے علم کا انحصار صرف حس اور تجربہ پر ہے اور خالص عقلی دلیل پر کان نہیں دھرتا ہے اس عقیدے کے جواب میں علامہ فرماتے ہیں: "یقیناً قارئین کرام کی اس بات پر توجہ ہے کہ بالکل وہی اعتراضات جو ہم نے مادہ پرستوں کی دلیلوں پر کئے ہیں وہ اس گروہ کی دلیلوں پر بھی (جو انہوں نے اپنے لئے قائم کی ہیں) وارد ہوتے ہیں علاوہ ازایں یہ خدشات بھی پائے جاتے ہیں:

اولاً تو یہ کہ اگر وہ اصول جواب تک منکشف ہوئے ہیں ان میں اتنی لیاقت نہیں پائی گئی کہ وہ روح کی اور زندگی کی حقیقت کو بیان کر سکیں اور اس بات کی کوئی دلیل نہیں قرار پا سکتی کہ بعد میں کبھی بھی ان کے انکشاف پر قادر نہیں پا سکے گی۔ نیز یہ بھی دلیل نہیں ہو سکتی ہے کہ وہ روحی ونفسانی خواص کہ جس کو آپ لوگ زندہ خلیوں کے آثار قرار دیتے ہیں، درحقیقت اب تک منکشف نہ ہونے والے مادی علل کے استناد پر واقع نہ ہوں لہٰذا آپ کے کلام میں مغالطہ پایا جاتا ہے کہ جس کی بابت آپ نے عدم کے علم کو عدم علم کی جگہ قرار دیا ہے"۔

"ثانیاً یہ کہ بعض حوادث عالم (یعنی مادی حوادث) کو مادہ کی طرف نسبت دینے اور اسی طرح بعض دیگر حوادث عالم (یعنی زندگی کے خواص اور دیگر حوادث) کو مافوق الفطرت (خداوند عالم) کی طرف نسبت دینے کا لازمہ یہ ہوگا کہ دنیا کے وجود میں لانے کے لئے

ہم دو قانون کے قائل ہوں، ایک مادی دوسرا الٰہی اور اس بات کو نہ تو مادہ پرست دانشور پسند کرتے ہیں اور نہ ہی الوہیت کے ماننے والے حضرات اس کو مانتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی توحید کے سبھی دلائل اس کو باطل قرار دیتے ہیں۔''

''البتہ اس درمیان تجرد نفس کے سلسلہ میں دیگر جگہوں پر اعتراضات بھی ہوئے ہیں کہ جن کا ذکر فلسفہ وکلام پر مبنی کتابوں میں ہوا ہے۔ البتہ ان سب کی اصل وجہ ہماری پیش کردہ دلیلوں پر عدم توجہ اور ہمارے دلائل کے مقصود و مراد کو نہ سمجھ پانے اور اس امر میں ناتوانی کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ الغرض یہ کہ یہ سب اس وجہ سے بھی ہوا ہے کہ جو دلیلیں ہم نے پیش کی ہیں انہوں نے اس پر توجہ نہیں دی اور نہ ہی انہوں نے ہمارے کہنے کے مقصود و مراد کی وجہ دریافت کرنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔''[1]

حقیقت روح

قرآن کریم کی آیات کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ روح ایک مستقل چیز ہے کہ جس کے پاس خود کی اپنی حیات وطاقت اور علم ہے اور ویسا نہیں ہے جیسا کہ دوسروں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ دیگر چیزوں منجملہ جسم یا ملائکہ کی طرح ہو بلکہ وہ تو محافظ وہمراہ اور جسم انسانی کو زندگی دینے والی اور ملائکہ نیز پوری کائنات ہستی کو حیات عطا کرنے والی ہے۔[2]

''خداوند عالم نے حقیقت روح کے بیان میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي﴾[3]

---

[1] المیزان، ج:۱ص:۵۵۷، ۵۵۸۔

[2] المیزان، ج:۱۲ص:۴۰۲، ۴۰۳۔

[3] سورۂ اسراء، آیت:۸۵۔

روح کا تعلق میرے رب کے حکم سے ہے۔

''اس آیت میں بہ ظاہر کلمہ ''مِن'' سے مراد یہ ہے کہ جنس کی حقیقت کو اسی طرح بیان کرتا ہے جس طرح کہ یہ لفظ روح کے بارے میں دیگر وارد ہونے والی آیات میں معنی کو بیان کرتا ہے جیسے:

{یُلْقِیْ الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِہٖ}[1]

اور یہ آیت: ﴿یُنَزِّلُ الْمَلَائِکَۃَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِہٖ﴾[2]

نیز یہ آیت: ﴿وَ کَذَالِکَ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾[3]

اور یہ آیت: ﴿تَنَزَّلُ الْمَلَائِکَۃُ وَالرُّوْحُ فِیْھَا بِاِذْنِ رَبِّھِمْ مِنْ کُلِّ اَمْرٍ﴾[4]

''ان سبھی آیات میں کلمہ ''من'' سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ روح، امر کی جنس اور سنخ سے ہے۔''

''اس کے بعد خداوند عالم دیگر آیتوں میں (امر) کی حقیقت کے بارے میں وضاحت دیتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ فَسُبْحَانَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ﴾[5]

بے شک اس کا حکم اس وقت ہے جب کسی چیز کا ارادہ کرے اور جیسے ہی یہ کہنا چاہے کہ ہوجا تو وہ ہوجاتی ہے، پاکیزہ ومنزّہ ہے وہ ذات کہ جس کی قبضۂ قدرت میں سب کچھ

---

[1] سورۂ مومن، آیت: ۱۵۔

[2] سورۂ نحل، آیت: ۲۔

[3] سورۂ شوریٰ، آیت: ۵۲۔

[4] سورۂ قدر، آیت: ۴۔

[5] سورۂ یٰس، آیت: ۸۲۔

ہے۔

''پہلے مرحلہ میں یہ آیت اس راز پر سے پردہ اٹھاتی ہے کہ اس کا حکم ''لفظ کن'' یعنی ''ہوجا'' کے تحت ہے جو کہ کلمۂ ایجابی ہے اور درحقیقت سبھی چیزوں کو وجود میں لانے والا ہے لیکن ہر لحاظ سے ہر چیز کا وجود نہیں بلکہ خداوند عالم سے ربط رکھنے والے جہات کی وجہ سے ہے اور اس وجہ اور ربط کی وجہ سے ہے کہ اس کا وجود اس کی ذات سے وابستہ اور قائم ہے۔''[۱]

''جملۂ ﴿ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن﴾[۲] ایک اہم پہلو کو واضح کرتا ہے کہ خداوند عالم خلقت کے سلسلہ میں کسی بھی اسباب و وجوہ کا محتاج نہیں ہے بنابریں ایسا نہیں ہے کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے خلق کرے، اسباب کے اختلاف کی وجہ سے اس کے لئے مختلف ہو، مثال کے طور پر ایسا نہیں ہے کہ کسی موجود کی تخلیق اس کے لئے ممکن ہو اور کسی دوسرے کی تخلیق ناممکن ومحال ہو یا ایک آسان ہو تو دوسرا مشکل ہو یا ایک قریب ہو تو دوسرا دور ہو۔ وہ جو کچھ چاہے اور ارادہ کرے اور یہ فرمائے کہ ''کن'' یعنی ہوجا تو وہ وجود میں آجاتی ہے۔ اب اس کام کے لئے اس کو اسباب و وجوہ کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔''[۳]

یہاں تک تو یہ بات ثابت ہوگئی کہ روح ملکوتی جنس سے ہے اور خداوند عالم کا امر ہے اور اس کی ملکوتیت اس لئے وجود اشیاء سے ہے کہ براہ راست اور بغیر کسی اسباب کی مداخلت کے خدا سے مربوط ہوتی ہے اور اس لئے اس کو امر کہا جاتا ہے کہ وہ خدا کے کلام اور حکم سے وجود میں آیا ہے۔

---

[۱] المیزان، ج:۱۳، ص:۲۷۲، ۲۷۳۔

[۲] سورۂ آل عمران، آیت:۵۹۔

[۳] المیزان، ج:۳، ص:۳۳۴۔

''وہ تمام دلیلیں کہ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جملہ اشیاء پروردگار کی ذات سے رابطہ کے سبب وجود میں آتی ہیں اور دیگر وجودی اسباب کے قطع نظر وہ کلام خدا ہیں، قرآن کی یہ آیت بھی دلیل ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ ﴿وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ﴾[1]

''اور ہمارا امر نہیں ہے مگر یہ کہ یگانہ (واحد) ہے اور وہ پلک جھپکاتے ہی وجود میں آجاتا ہے۔''

''اس آیت میں حکم خداوندی کی یکتائیت بتانے کے بعد، لمح بصر (چشم زدن) سے تشبیہ دیتے ہیں کہ جس کا مقصد تدریجی نفی کا ہونا ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش ہورہی ہے کہ باوجود اس کے کہ مادی موجود مخلوق کو تدریجی اور مادی اسباب و وسائل کے توسط سے خلق کیا گیا ہے اور ان سب کو موقع و محل کے مطابق خلق کیا گیا ہے اس کے باوجود ان کی ایک وجہ یہ بھی پائی جاتی ہیں جو کہ تدریجی اور موقع و محل کے پیرائے اور زنجیر سے وابستہ نہیں ہیں اسی لئے اس کو امر خداوندی اور اس کا ''قل اور کلمہ'' شمار کیا گیا ہے۔

''لیکن ہر چیز کو ایک دوسرے لحاظ سے کہ جسے علل و اسباب کے ذریعہ قرار دیا گیا ہے اور اس کا انطباق و اطلاق موقع و محل پر کیا جاتا ہے، حکم خداوندی قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ وہ خلق خدا ہے جیسا کہ فرمایا ہے:

{أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ}[2]

جان لو کہ خلق اور امر صرف خدا سے مخصوص ہے۔

''لہٰذا امر'' ہر موجود کا وجود ہے اس لحاظ سے کہ اس کی نسبت صرف خدا سے دی جاسکتی ہے اور اس سے مربوط ہے کہ جس میں کسی سبب یا علت کی وساطت و ثالثی نہیں ہوتی ہے اور خلق

---

[1] سورۂ قمر، آیت: ۵۰۔

[2] سورۂ اعراف، آیت: ۵۴۔

سے مراد علل و اسباب کے ذریعہ یا خدا سے ربط دینے کے لحاظ سے ہر موجود کا وجود ہے۔" اور روح کی حقیقت، امر کی جنس سے ہے یعنی روح، اس وجہ سے اشیاء کا وجود ہے کہ اس کا رابط خدا سے واسطہ کے بغیر ہوتا ہے۔[1]

عیسیٰؑ، روح خدا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں معمول کے مطابق رائج یا کسی مادی اسباب و علل اور ثالث کی مداخلت کے بغیر، حکم خداوندی سے دنیا میں تشریف لائے، اسی وجہ سے قرآن مجید میں انہیں روح اور کلمۂ خداوندی سے متعارف کرایا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں علامہ طباطبائی رقمطراز ہیں! قرآن مجید نے عیسیٰ علیہ السلام کو چونکہ وہ رائج طریقوں سے ہٹ کر اور بغیر باپ کے وسیلہ بنے ہوئے جناب مریمؑ کو عطا ہوئے تھے اس لئے خداوند عالم نے انہیں اپنا کلمہ اور روح قرار دیتے ہوئے فرمایا:

{وَ كَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِنْهُ}[2]

"اور اسی مفہوم سے تقریباً مطابقت کرتی ہوئی یہ آیت بھی ہے کہ جس میں فرمایا:

{إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ}[3]

خداوند عالم کے نزدیک عیسیٰ (علیہ السلام) کی مثال آدم علیہ السلام کی مانند ہے کہ انہیں بھی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ پھر ان سے کہا گیا کہ ہو جاؤ تو وہ ہو گئے۔ اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ کی داستانِ خلقت کی تشبیہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش و خلقت

---

[1] المیزان، ج: ۱۳، ص: ۲۷۳۔

[2] سورۂ نساء، آیت: ۱۷۱۔

[3] سورۂ آل عمران، آیت: ۵۹۔

سے دی گئی ہے۔"[1]

"اس آیت میں سب سے پہلے خلقت آدمؑ کا تذکرہ ہوا ہے اور مٹی کے ساتھ ان کے ارتباط کو جو کہ اسباب میں سے ایک ہے، جوڑا گیا ہے اور پھر اسی وجود کو بغیر کسی رابطہ کے "کن" کی تعبیر سے یاد کیا گیا ہے۔

"مذکورہ آیت کی مانند یہ آیت بھی ہے:

{ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ}[2]

کیوں کہ خداوند عالم نے ایجاد و تخلیق کو جو کہ خود اسی سے منسوب ہے اور دیگر علل و اسباب کے سلسلے درمیان میں نہیں ہیں، دوسری خلقت کا نام دیا ہے۔[3]

ملکوتی معرفت

ظاہری و ملکی صورت نیز زمین و آسمان میں اس کی نشانیوں، حتی کہ ہمارے جسم کے ذریعہ اس کی معرفت و شناخت، دور سے اور بالواسطہ شناخت ہے کہ جو آخرالامر خدا کے بعض اسماء و صفات کو ثابت کرتے ہیں، جیسے کہ خدا حکیم و دانا اور طاقتور و کریم وغیرہ ہے۔

لیکن ملکوتی معرفت کا حصول عالمیان اور خود کی روح نیز زمین و آسمان کی روح کی معرفت کے ذریعہ ممکن و میسر ہے جو کہ برتر و مکمل ترین معرفت ہے۔

ملکوتی معرفت میں خدا کو چشم دل سے دیکھا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ اور حصول یقینی خالص اور بالکل ہی کھرا ہوتا ہے جو کہ صرف انبیاء و خاص اولیاء کو ہی حاصل ہوسکتا ہے یہ انہی لوگوں کو

---

[1] المیزان، ج:۲۰، ص:۲۸۰، ۲۸۱۔

[2] سورۂ مومنون، آیت:۱۴۔

[3] المیزان، ج:۱۳، ص:۲۷۳، ۲۷۴۔

حاصل ہوسکتا ہے جو سارے امور کو اسی سے مربوط جانتے ہیں اور دیکھتے ہیں اور جنہوں نے توحید افعالی اور وحدت علت اور دیگر سبھی علل و اسباب کے کھوکھلے ہونے کا پتہ لگالیا ہے۔

علامہ نے روح کی حقیقت کے سلسلہ میں اپنی بحث میں جو پیش کیا ہے اس سے نتیجہ نکالتے ہیں کہ ''اس کا امر ہر چیز میں ہے یعنی اس چیز کا ملکوت ہے اور یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ آیت میں ملکوت اور خداوند عالم کے لئے کسی چیز میں اس کی نشانی کا وجود ملک سے کہیں بالاتر ہے۔''

''بنابریں ہر وجود کے لئے ایک ملکوت اور امر ہے جو دیکھنے کے قابل ہے اور اس کی معرفت کا سبب اور ذریعہ ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

{أَوَلَمْ يَنظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ}[1]

کیا آسمانوں اور زمین کے ملکوت کا مشاہدہ نہیں کرتے ہو؟ نیز یہ بھی فرمایا:

{وَكَذَٰلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ}[2]

ہم نے آسمانوں اور زمین کے ملکوت کو ابراہیم کو دکھا دیا۔[3]

اسی طرح لوگوں کی روحیں اور دنیا کی دیگر مخلوقات جو کہ امر اور ملکوتی موجود مخلوق ہیں، وہ پروردگار عالم کے جمال و کمال کی بہتر طریقہ سے نشاندہی کراتے ہیں، اس بات کے پیش نظر کہ ملکوتی روحیں امر اور قول خدا سے وجود میں آئی ہے، ان کو کلمۂ خداوندی کا نام دیا جاسکتا ہے اور یہ موجودات و مخلوقات جو کہ ملکوتی ہیں ان کی تخلیق کے مقصد اصلی کو جو کہ معرفت ہے، بہتر طور پر حاصل کرسکتی ہیں۔

---

[1] سورۂ اعراف، آیت: ۱۸۵۔

[2] سورۂ انعام، آیت: ۷۵۔

[3] المیزان، ج: ۱۳، ص: ۲۷۴۔

اس نفیس پہلو کو اس آیت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

{وَ کَذَالِکَ أَوْحَیْنَا إِلَیْکَ رُوحاً مِنْ أَمْرِنَا}[1]

"میں نے اپنے حکم پر مبنی روح کو تم پر وحی کی"۔

علامہ اس آیت کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

"باوجود اس کے کہ روح عینی موجود اور بیرونی اعیان و موجود کا حصہ ہے اور وحی پوشیدہ کلام کے معنی میں ہے، اس وجہ سے وحی کو روح کی نسبت دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: روح کو تمہارے لئے وحی کی گئی کہ موجودات کا یہ سلسلہ (یعنی ارواح) طاہر و مقدس موجودات ومخلوقات کا سلسلہ ہے جو کہ پیدائش خلقت سے خدا کی جانب سے پاکیزہ قرار پایا ہے کہ جس کا تعلق عالم امر وملکوت سے ہے اس لئے یہ سب کلمات خداوندی میں سے ہیں..."

"پس روح کو اس لحاظ سے کلمہ بتایا گیا کہ دیگر کلمات کی مانند اپنے مالک کے مراد پر دلالت کرتی ہے (اور اپنی خلقت کی پاکیزگی وطہارت کے ذریعہ خدائے متعال کو زیادہ آشکار او ظاہر کرتی ہے) اور جب روح کو کلمہ قرار دیا جاسکتا ہے تو اسے وحی بھی کہا جاسکتا ہے۔"[2]

حقیقت روح کے بیان پر مبنی روایات

حقیقت روح کے بیان میں بہت سی گرانقدر روایتیں وارد ہوئی ہیں کہ جن میں سے کچھ روایتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے:

کافی نے اپنی سند میں ابو بصیر سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام صادقؑ

---

[1] سورۂ شوریٰ، آیت: ۵۲۔

[2] المیزان، ج: ۱۳، ص: ۲۷۲۔

سے آیہ ''وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی'' کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب میں فرمایا:

روح جبرئیل ومیکائیل سے بھی برتر مخلوق ہے جو ہمیشہ رسول خداؐ کے ساتھ رہا کرتی تھی اور وہی روح اماموں کے ساتھ بھی ہے کہ جو عالم ملکوت میں سے ہے۔[1]

ابوبصیر سے یہ بھی روایت ہوئی ہے کہ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام نے مذکورہ آیت کے سوال کے جواب میں فرمایا:

''روح وہی ہے جو سبھی ذی روح میں پائی جاتی ہے۔ ابوبصیر کا کہنا ہے کہ میں نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ تو فرمایا:

عالم ملکوت اور خدا کی طاقت وقدرت کا ایک حصہ ہے۔''[2]

''بنابریں جو کچھ بیان ہوا اور اس کی تفصیل پر بحث ہوئی ''يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی'' اس کا مفہوم ومطلب واضح ہوگیا اور یہ معلوم ہوگیا کہ روح سے متعلق سوال پر مبنی آیت کا جواب حقیقت روح کے بیان پر مشتمل ہے اور یہ کہ روح امر کے مقولے میں شامل ہے جیسا کہ اس کا بیان گذر چکا ہے۔''

''لیکن ''وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا'' جو ''قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی'' کے آگے آیا ہے، اس معنیٰ میں ہے کہ روح کا وہ علم جو خدا نے تمہیں دیا ہے بہت ہی تھوڑا ہے کیوں کہ اس عالم وجود میں روح کی اپنی پوزیشن ہے اور اس عالم وجود میں اس کے جو آثار وخواص ظاہر ہوتے ہیں وہ بہت ہی وسیع وبے مثال اور عجیب وغریب ہیں کہ جن کے زیادہ تر آثار وخواص سے آپ بے خبر ہیں۔[3]

---

[1] المیزان، ج ۱۳، ص: ۲۹۵ بہ نقل نور الثقلین، ج: ۳، ص: ۲۱۵۔

[2] المیزان، ج: ۱۳، ص: ۲۹۶، ماخوذ تفسیر عیاشی، ج: ۲، ص: ۳۱۷۔

[3] المیزان، ج: ۱۳، ص: ۲۷۶۔

''بیہقی نے اپنی کتاب، اسماء وصفات میں علی بن ابی طالب علیہ السلام سے روایت نقل کی ہے کہ جس میں انہوں نے آیہ ''یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوحِ'' کے ذیل میں فرمایا ہے کہ روح ایک ایسا فرشتہ ہے کہ جس کے ستر ہزار چہرے ہیں اور اس کا ہر چہرہ ستر ہزار زبان اور ہر زبان میں ستر ستر ہزار کی زبانیں اور ان کے لغات والفاظ ہیں کہ جن کے ذریعہ کلام اور تسبیح خداوندی کی جاتی ہے اور خداوند عالم اس کی ہر تسبیح سے ایک ایسا فرشتہ خلق کرتا ہے، جو قیامت کے دن تک دیگر فرشتوں کے ساتھ محو پرواز رہے گا۔''[1]

علامہ اس حدیث کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

''روح کے ملائکہ ہونے پر مبنی کچھ قرآنی آیات کے ظاہر سے سازگاری وجود میں نہیں آتی ہے کیوں کہ بہت سی آیات کے ظاہر سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ روح ایک طرح کی مخلوق ہے کہ جس کو فرشتہ نازل کرتا ہے اور اس کی مثال میں یہ آیت پیش کی جاسکتی ہے۔

{یُنَزِّلُ الْمَلَآئِکَةَ بِالرُّوحِ مِنْ اَمْرِهٖ}[2]

اس کے علاوہ دیگر آیتیں بھی ہیں جو اس طرح کی روایتوں سے میل نہیں کھاتی ہیں۔[3]

پھر بھی ایسا لگتا ہے کہ اس روایت نے باوجود اس کے کہ روح کو ملک کے عنوان سے یاد کیا ہے لیکن اس کو ملائکہ کی تخلیق و وجود میں آنے کا ذریعہ اور منبع شمار کرتے ہوئے ملائکہ سے افضل و برتر بتایا ہے۔ اگر ہم اس کو ایسے منفرد و مجرد موجود کو کہ جسے شعور وارادہ بھی حاصل ہو، ملک مانیں اور غیر خدا کے علاوہ ملک سمجھیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ روح کو جو کہ خداوند عالم کی قریبی ترین مخلوق ہے اور ملائکۂ آسمان کی تخلیق کا سبب ہے اس کو بھی ملک کہیں کیوں کہ وہ دیگر ملائکہ سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے۔

---

[1] المیزان، ج: ۱۳، ص: ۲۹۵ بنقل از الدر المنثور، ج: ۴، ص: ۲۰۰۔

[2] سورۂ نحل، آیت: ۲۔

[3] المیزان، ج: ۱۳، ص: ۲۹۵۔

روح کے درجات

"خداوند عالم نے زیادہ تر مواقع پر اپنے کلام میں روح کا ذکر اضافات اور قید و شرط کے ساتھ کیا ہے۔ مثال کے طور پر، "وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي" اور فرمایا:

{وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ}[1]

یا ﴿فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا﴾[2]

یا فرمایا: ﴿وَرُوحٌ مِنْهُ﴾

سورۂ نساء، آیت: ۱۷۱۔

یا فرمایا: ﴿وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ﴾[3]

یا ایسی دیگر آیات کہ جس میں میری روح، اس کی روح، ہماری روح، اس سے متعلق روح، روح القدس اور روح الامین وغیرہ جیسے جملات کا استعمال کیا ہے۔

"لیکن بعض مواقع پر بغیر کسی قید و شرط کے بھی استعمال کیا ہے، جیسے:

{تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ}[4]

کہ جس کے ظاہر سے ایسا لگتا ہے کہ روح ایک مستقل موجود، آسمانی مخلوق اور ملائکہ کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔

جیسے کہ یہ آیت جس میں فرمایا ہے:

{تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ}[5]

---

[1] سورۂ سجدہ، آیت: ۹۔

[2] سورۂ مریم، آیت: ۱۷۔

[3] سورۂ بقرہ، آیت: ۸۷۔

[4]

[5]

ملائکہ اور روح ایک ایسے دن کہ جو پانچ ہزار سال کے برابر ہوگا اوپر بلائے جائیں گے۔

''....ان آیتوں کے جمع کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مضاف (نسبت دی گئی) روح کی مطلق روح سے نسبت دینا افاضہ کی مفیض (فیض پہنچانے والے) کی طرف نسبت دینے کی طرح ہے یا اس سایہ کی نسبت کی طرح ہے کہ جس کو خدا نے اپنی طرف دی ہے۔''[1]

بنابریں روح ایک واحد و یکتا اور بے مثال مخلوق و موجود ہے کہ جسے خداوند عالم نے خلق کیا اور اس کو دنیا میں حیات و ہستی کا مبداء و منشاء قرار دیا اور ہستی نیز دیگر موجودات و مخلوقات عالم اس سے فیض حاصل کرتی ہیں۔

''قرآن کریم کی آیات سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے یہ ہے کہ روح خدا کی خلق کردہ ایک مخلوق ہے جو ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کے مختلف درجات و مراتب ہیں۔''[2]

تفسیر المیزان میں پراکندہ طور پر مجموعۂ مطالب سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ روح کی شناخت کے سلسلہ میں سات درجات و مراتب ذکر کئے گئے ہیں:

۱۔ مطلق روح: دیگر سبھی مخلوق و موجود کی حیات کا اصل اور منشاء نیز ملائکہ اور روح کے دیگر نچلے مراتب کے وجود میں آنے کا سرچشمہ ہے۔

۲۔ وحی یا ایحاء کی روح: جو وحی کے نزول کے موقع پر خدائی پیغام کے ہمراہ ہوتی ہے تا کہ اس کے ذریعہ سے انبیاء وحی کو حاصل کرسکیں۔

۳۔ ملکی روح: تمام ملائکہ اپنے مقام و مرتبہ اور درجات کے فرق کے ساتھ روح کی جنس

---

[1] المیزان، ج:۲۰،ص:۲۸۱ اور ۲۸۲۔

[2] المیزان، ج:۱۲،ص:۳۰۵۔

سے ہیں۔

۴۔ ایمانی روح یا تائید: جو تمام مومنین کے ساتھ رہتی ہے اور انہیں حیات طیبہ عطا کرنے کے ساتھ ہی لغزشوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

اس روح کا فیض وہ لوگ اٹھانے کے اہل ہوتے ہیں جو اہل ایمان ہوں اور جنہوں نے عمل صالح انجام دیا ہو۔

۵۔ روحِ نفخ یا بشری روح: یہ ایسی روح ہوتی ہے جو انسان کے اندر حالت جنین و نطفہ کے موقع پر ہی ڈال دی جاتی ہے، اس روح کے اندر اتنی صلاحیت و توانائی ہوتی ہے کہ انسان کے اندر اگر ایمان و اخلاص کی طاقت زیادہ پائی جائے گی تو یہ روح کے اعلیٰ تر درجہ پر پہنچتے ہوئے ملکی روح اور وحی کی روح کے درجے سے گذر کر روح مطلق وابستہ سکتی ہے جو اس کی بنیاد و اساس ہے۔

۶۔ حیوانی روح: سبھی زندہ حیوانات روح کے مالک ہوتے ہیں کہ جن کے پاس انسانوں سے کمتر درجہ کی روح پائی جاتی ہے اور شعور و ارادہ کے لحاظ سے کمتر درجے کے حاصل ہونے کے ساتھ ہی حیوانی حد تک ہوتے ہیں۔

۷۔ نباتی روح: رشد و نمو، غذائیت، جفتی و لقاح اور نباتات و گیاہ میں پائے جانے والی دیگر علائم و خصوصیات، نباتات کی روح میں شمار کی جاتی ہیں جو کہ حیوانی روح سے قدرے کمزور اور صرف نباتی نوعیت کی حیات کے ایجاد و قیام میں کارگر و مؤثر ہیں۔

روح کے درجات و مراتب کے سلسلہ میں علامہ فرماتے ہیں: ''ہر جگہ روح کے وہ معنیٰ مراد نہیں ہیں جو جانداروں میں روح کے معنی پائے جاتے ہیں اور جو جانداروں میں مبدأ حیات اور احساس و ارادی حرکت کا منشاء قرار پاتے ہیں، مثال کے طور پر ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

{يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا}[۱]

یعنی جس دن روح اور ملائکہ اٹھائے جائیں گے اور صف میں لاکر کھڑے کئے جائیں گے وہ قیامت اور حساب و کتاب کا دن ہوگا۔

نیز یہ بھی فرمایا ہے:

"تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا"

کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں آیات میں روح سے حیوانی روح و ملائکہ سے الگ روح مراد ہے۔[۲]

ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ خداوند عالم نے قرآن کریم میں جو کچھ فرمایا ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ روح کبھی ملائکہ کے ساتھ ہوتی ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے پتہ چلتا ہے۔

{مَن كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ}[۳]

جو کوئی جبرئیل کا دشمن ہے، بہ تحقیق کہ خدا جبرئیل کو (نزول وحی کے موقع پر) تمہارے قلب پر نازل کرے گا" ایک دوسری آیت میں فرمایا:

{نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ}[۴]

روح الامین قرآن کو تمہارے قلب پر نازل کرے گا۔

(ان دونوں آیتوں کو سامنے رکھنے سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ یا تو جبرئیل وہی روح الامین ہیں کہ جنہیں علامہ قبول نہیں کرتے ہیں یا یہ کہ روح الامین وہ ہے جو جبرئیل کے ساتھ وحی و قرآن لایا کرتا تھا) یا فرمایا:

---

[۱] سورۂ نباء، آیت: ۳۸۔

[۲] المیزان، ج: ۱۳، ص: ۲۷۰۔

[۳] سورۂ بقرہ، آیت: ۹۷۔

[۴] سورۂ شعراء، آیت: ۱۹۳۔

{فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَراً سَوِيّاً}

پس ہم نے مریم کی طرف اپنی روح کو بھیجا اور وہ اس کے لئے بشری صورت میں ظاہر ہوئی...

''اور بعض اوقات اس کو روح کی حقیقت بتایا گیا ہے کہ جس سے انبیاء رابطہ رکھتے ہیں اور اس کے بارے میں فرمایا:

{يُنَزِّلُ الْمَلاَئِكَةَ بِالْرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ}[1]

فرشتوں کو روح کے ہمراہ اس کے حکم سے جس پر تو چاہے نازل کرتا ہے۔

نیز یہ بھی فرمایا:

{وَ آتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَ أَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ}

ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو کچھ نشانیاں دیں اور اس کو پاکیزہ روح کے ساتھ استحکام بخشا۔

اور اس کے علاوہ یہ بھی فرمایا:

{وَ كَذَالِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحاً مِّنْ أَمْرِنَا}[2]

اور اس طرح سے روح کو تمہاری جانب وحی کرتے ہیں اور قرآنی آیات کی تمہیں تعلیم دیتے ہیں۔[3]

یہاں پر یعنی آخری مطلب کے بیان میں علامہ روح کے دو مراتب کا ذکر کرتے ہیں کہ جن کا فرق زیادہ واضح نہیں ہے اور ان آیات میں کہ جنہیں شاہد و دلیل کے طور پر پیش کر رہے

---

[1] سورۂ نحل، آیت: ۲۔

[2] سورۂ شوریٰ، آیت: ۵۲۔

[3] تفسیر المیزان، ج: ۱۳، ص: ۲۷۴، ۲۷۶۔

ہیں مناقشہ پایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے ایک ایسی روح کا ذکر کیا ہے کہ جو ملائکہ کے ہمراہ ہے اور دلیل میں جن آیات کو پیش کیا ہے وہ ایسی تھیں جو روح کے دوسرے مرتبہ یعنی وحی کی روح پر دلالت کرتی تھیں یعنی وہی روح کہ جس سے پیغمبروں کا رابطہ ہوا کرتا تھا اور وہ الٰہی پیغام حاصل کیا کرتے تھے۔

البتہ پہلے مقام میں ایک آیت مستثنیٰ تھی اور وہ بھی روح خدا کا بذریعۂ جبرئیل جناب مریم علیہا السلام کی طرف بھیجا جانا ہے جو کہ انبیاء میں سے نہیں تھیں اور جبرئیل امین روح کے ذریعہ ان پر نازل ہوئے پھر خدا کا پیغام پہنچا کر الٰہی ذمہ داری کو انجام دیا۔

دوسرے مقام میں شاید وہ اسی روح کے بارے میں بیان کر رہے تھے اور جو آیتیں پیش کی ہیں منجملہ سورۂ شوریٰ کی آیت ۵۲ اور سورۂ نحل کی آیت ۱۳ یہ دونوں ہی اس روحِ وحی پر دلالت کرتی ہیں۔

لیکن سورۂ بقرہ کی آیت ۸۷ بھی جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقویت واستحکام کے لئے ہے زیادہ تر روح کے ساتھ منطبق ہونے والی تائید کی نشاندہی کرتی ہے نہ کہ وحی کی روح کی طرف کہ جس کے بارے میں آگے چل کر بحث کی جائے گی۔

تاہم علامہ کی جانب سے پیش کردہ روح کے مراتب کی بحث کے دوران آگے چل کر انہوں نے کہا: ''کبھی تو وہ ایسی حقیقت بن جاتی ہے جو مؤمنین کے ہمراہ ہوتی ہے، جس کو روح پکارا جاتا ہے اور اس کے بارے میں خداوند عالم نے فرمایا ہے:

{أُولَئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ}[1]

مؤمنین وہ لوگ ہیں کہ جن کے دلوں میں ایمان رقم کر دیا گیا ہے اور انہیں خداوند عالم کی جانب سے عطا کردہ روح کے ذریعہ مستحکم کیا گیا ہے۔...

---

[1] سورۂ مجادلہ، آیت: ۲۲۔

''اور کبھی اس کو ایک ایسی حقیقت سے تعبیر کیا گیا ہے جو زندہ جانوروں اور نباتات میں موجود ہوتی ہے اور کچھ آیتوں کے ذریعہ اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے یعنی جانوروں اور نباتات کی زندگی کو روح بتایا گیا ہے کیوں کہ ہم نے پہلی ہی کہا ہے کہ حیات روح کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔''[۱]

ملائکہ کی روح

''جو روح ملائکۃ اللہ کی ہے وہ افاضہ' روح (روح مطلق یا واحد) بہ اذن پروردگار عالم ہے، اگر انسانی روح کے سلسلہ میں دو تعبیر نفخ او تائید کا ذکر کیا ہے تو اس کی جگہ ملائکہ کے بارے میں فرمایا: ''فَاَرْسَلْنَا اِلَیْهَا رُوْحَنَا'' یا فرمایا: ''قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ'' یا فرمایا: ''نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ'' یہ اس لئے تھا کہ سارے فرشتے خداوند عالم سے دوری ونزدیکی کے حوالے سے مراتب میں تمام اختلافات کے باوجود، خالص ومحض روح ہیں اور اگر کبھی جسمانی شکل میں خاص افراد کے لئے ظاہر بھی ہوتے ہیں تو مثالی وصوری حیثیت (کسی کی شکل) اختیار کر لیتے ہیں نہ یہ کہ حقیقت میں ان کے جسم اور اعضائے جسمانی پائے جاتے ہیں۔''[۲]

یہاں پر بھی مبہم مطالب پائے جاتے ہیں کیوں کہ علامہ کا ماننا ہے کہ قرآنی آیات اور روایات معصومینؑ میں روح کا تعارف ملائکہ سے الگ ہٹ کر کرایا گیا ہے لہٰذا یہاں پر ملائکہ کے روح ہونے کے سلسلہ میں انہوں نے جو آیات پیش کی ہیں انہی آیات کو دوسری جگہ پر (کہ جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے) روح کو ملائکہ کا ہمراہی ہونے کے ثبوت میں پیش کیا ہے اس لئے علامہ کا مقصود ہمارے لئے واضح نہیں ہے اور ایسا لگتا ہے کہ علی الظاہر بعض مواقع (منجملہ سورۂ مریم) میں

---

۱ المیزان، ج:۱۳، ص:۲۷۵، ۲۷۶۔ اسی طرح ج:۲۰ میں صفحات ۲۸۱ تا ۲۸۳، میں غیر مرتب طور پر روح کے مراتب کا ذکر ہوا ہے۔

۲ تفسیر المیزان، ج:۲۰، ص:۲۸۲۔

روح سے مراد جبرئیل کو لیا گیا ہے البتہ بہت سے مواقع پر مثلاً جہاں مطلق روح آیا ہے یا روح و ملائکہ کا ایک ساتھ ذکر ہوا ہے وہاں ملائکہ کے علاوہ بلکہ ملائکہ سے برتر مخلوق کا ذکر ہوا ہے۔

روح کے مراتب کے سلسلہ میں جو کچھ بھی بیان ہوا اس کی بنیاد پر المیزان کے بہت سے پیچیدہ اور الجھے ہوئے مطالب آسان ہوجاتے ہیں لیکن متذکرہ سات مراتب و درجات میں سے تین مراحل کا (جو کہ ابتداء میں ہیں) واضح کرنا زیادہ ضروری نظر آتا ہے، یعنی روح مطلق، روح وحی اور روح ایمان یا روح تائید پر زیادہ بحث اور وضاحت کی ضرورت ہے۔

روح وحی

''ایک آدمی حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی خدمت میں آیا اور روح کے بارے میں سوال کیا اور پوچھا کہ کیا روح وہی جبرئیل ہیں؟ حضرتؑ نے فرمایا: جبرئیل ملائکہ میں سے ہیں اور روح جبرئیل کے علاوہ ہے''۔

سعد کہتے ہیں کہ یہ جواب سوال کرنے والے کو برا لگا، اس نے عرض کیا: آپ نے ایسی بڑی بات کہہ دی کہ آج تک کسی نے ایسی بات نہیں کہی تھی کیوں کہ کسی نے یہ احتمال نہیں دیا ہے کہ روح جبرئیل کے علاوہ کوئی اور شئے ہو۔

امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے فرمایا: تم ایسے گمراہ آدمی ہو جو گمراہوں کی بات نقل کررہے ہو کیوں کہ خداوند عالم نے فرمایا ہے:

{...يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ...}[1]

یہ آیت آشکارا طور پر کہہ رہی ہے کہ ملائکہ اور روح الگ الگ ہیں۔[2]

علامہ اس بات کے بارے میں کہ ''روح وحی'' غیر ملائکہ ہے، فرماتے ہیں:

---

[1] سورۂ نحل، آیت: ۱۔ ۳۔

[2] المیزان، ج: ۱۲، ص: ۳۲۷، ۳۲۸، بہ نقل از اصول کافی، ج: ۱، ص: ۲۷۴۔

”قرآن کریم نے ایک جگہ روح کو قدس اور دوسری جگہ امانت سے معنون کیا ہے اور اس کی توصیف کی ہے کیوں کہ ان خباثتوں اور مادی و معنوی آلودگیوں اور ناپاکیوں نیز ان برائیوں اور عیبوں سے جن سے انسانی روح آلودہ ہوا کرتی ہے، یہ روح پاکیزہ ہوا کرتی ہے۔ یہ روح باوجود اس کے کہ ملائکہ سے ہٹ کر ہے لیکن ملائکہ کے ساتھ ان کی تبلیغ ووحی کے علاوہ ہے جیسا کہ اس آیت سے مستفاد ہے:

”یُنَزِّلُ الْمَلَآئِکَةَ بِالرُّوحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَشَآءُ...“

”دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کو مجتمع کر کے لانے والے کو جبرئیل کا نام دیتے ہوئے فرمایا ہے:

{قُلْ مَنْ کَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰهِ}[1]

اور دوسری جگہ جبرئیل کو روح الامین بتاتے ہوئے قرآن لانے والا بتایا اور فرمایا:

{قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّکَ}[2]

اور روح القدس کو جو ایک طرح سے غیر ملائکہ میں سے ہے جبرئیل کے بجائے جو خود ملائکہ میں سے ہیں قرآن لانے والا بتایا ہے، اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ جبرئیل روح لانے والے ہیں اور روح یہ پڑھے جانے والے قرآن کی حامل ہے۔“[3]

”یہیں سے وہ گرہ اور مشکل جو آیۂ ﴿وَ کَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾[4] تھی برطرف ہو جاتی ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ مذکورہ آیت میں وحیِ روح سے مراد رسول خداؐ پر روح القدس کا نازل کیا جانا ہے اور حضرتؐ پر روح القدس کا نازل ہونا ہی آنحضرتؐ

---

[1] سورۂ شعراء، آیت: ۱۹۵۔

[2] سورۂ نحل، آیت: ۱۰۲۔

[3] المیزان، ج: ۱۳، ص: ۲۰۷، ۲۷۱۔

[4] سورۂ شوریٰ، آیت: ۵۲۔

پر قرآن کا وحی ہونا ہے۔"[۱]

اس کی مزید وضاحت اس طرح سے ہے کہ "روح" وہ کلمۂ حیات ہے کہ جس کو خداند عالم نے مختلف چیزوں میں استعمال کر کے ان کو زندہ کرتا ہے، اسی لئے آیہ "وَ كَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا" میں روح کو وحی کا نام دیا اور رسولؐ کے قلب پر اس کے نزول کو "ایحاء" بتایا ہے۔

"بنابریں رسول خداؐ کے قلب مبارک پر کلمۂ حیات کے القاء کا مطلب یہ ہوا کہ روح کو ان کی طرف وحی کرے"۔[۲]

یعنی جو کچھ پیغمبر اکرمؐ پر وحی ہوا کرتی تھی وہ آپؐ کے قلب مبارک کا سرمایہ حیات ہوتا تھا۔

"بنابریں یہ جو فرمایا: "يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ" اگر صرف "ب" کو سببیت یا مصاحبت کے معنی میں لیں تو معنی ایک ہی ہوگا اور زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔

"چوں کہ ملائکہ کا نزول، روح کی ہمراہی و مصاحبت کے ساتھ ہے یعنی اس کا القاء جو پیغمبر اکرمؐ کے قلب پر ہوا ہے وہ اس لئے ہے کہ اس روح کے ذریعہ معارف الٰہی کو حاصل کرنے کے لئے آمادگی حاصل کریں"۔

"اسی طرح روح کے سبب ملائکہ کا نزول بھی اسی معنی میں ہے کیوں کہ خداوند عالم کا کلمہ جو کہ حیات ہے اس نے ملائکہ پر اثر کیا اور انسانوں کی مانند زندہ کر دیا۔"[۳]

---

[۱] المیزان، ج:۱۳، ص:۲۷۱۔

[۲] المیزان، ج:۱۲، ص:۳۰۳۔

[۳] المیزان، ج:۱۲، ص:۳۰۳۔

تائیدی روحی

{أُوْلَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ}[1]

اہل ایمان وہ لوگ ہیں کہ جن کے دلوں میں ایمان کو لکھ دیا گیا ہے اور انہیں خداوند عالم کی جانب سے بذریعۂ روح مستحکم کیا گیا ہے۔

''کلمۂ تائید، تقویت کے معنی میں ہے اور ''أَيَّدَهُمْ'' کی فاعلی ضمیر ''اللہ'' کی جانب پلٹتی ہے اور اسی طرح ''منه'' میں بھی ضمیر ''أَيَّدَهُمْ'' کی طرح اللہ کی جانب پلٹتی ہے اور یہ ابتدائیہ کلمہ ہے اور جملہ کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم نے مؤمنوں کو اپنی روح کے ذریعہ استحکام بخشا ہے اور کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ ضمیر ایمان کی جانب پلٹتی ہے اور جملہ کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم نے انہیں ایمان نامی چیز سے ان کی روح کو استحکام بخشا ہے اور ان کے دلوں کو اس روح کے ذریعہ زندگی یا حیات بخشی ہے۔ اس مطلب میں بھی کوئی پریشانی نہیں ہے۔

''کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا ہے: روح سے مراد جبرئیل ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے۔ نیز کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ روح سے مراد حجت و برہان ہے اور یہ سبھی اقوال کمزور وجوہات پر مبنی ہیں کہ جن کا آیت کے لحاظ سے شاہد موجود نہیں ہے۔''

''ایک پہلو جو یہاں پایا جاتا ہے یہ ہے کہ جس طرح سے اس آیت کے معنی سے سمجھ میں آتا ہے کہ روح مبدأ حیات ہے کہ جس سے قدرت و شعور کا حصول ہوتا ہے بنابریں اگر ''وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ'' کی عبارت کو ظاہری معنیٰ پر باقی رکھیں تو یہ معنی نکل کر سامنے آئے گا کہ مؤمنین کے اندر پائی جانے والی روح غیر مؤمنین و کافروں کے اندر پائی جانے والی بشری روح سے ایک الگ روح ہے کہ جس سے الگ زندگی حاصل ہوتی ہے اور اس سے نئی قدرت و شعور کا

---

[1] سورۂ مجادلہ، آیت: ۲۲۔

ظہور ہوتا ہے اور مندرجہ ذیل آیت بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہے:

{أَوَ مَن كَانَ مَيتاً فَأَحْيَيْنَاهُ وَ جَعَلْنَا لَهُ نُوراً يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَن مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا}[۱]

کیا وہ شخص مر چکا ہے اور اس کو ہم نے پھر سے زندہ کیا اور اس کے لئے ایسا نور قرار دیا جو اس کے ذریعہ لوگوں کے درمیان راستہ طے کر سکے، وہ اس شخص کی طرح ہے جو اندھیرے میں ہے اور اس کے لئے گلو خلاصی کا کوئی راستہ نہیں ہے؟

نیز یہ آیت کہ جس میں فرماتا ہے:

{مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً}[۲]

جو شخص نیک عمل انجام دے گا چاہے وہ مرد ہو یا عورت، جب کہ وہ مؤمن بھی ہو تو ہم اسے پاک و پاکیزہ حالت میں ہی زندہ کریں گے۔

''اسلام میں حیات طیبۃ کا لازمہ پاکیزگی کے اثر کے ہمراہ ہے، حیات کا اثر (جو کہ طاقت و شعور ہے) زندگی میں طیب و طاہر اور پاک و منزہ ہوگا اور جب طاقت و شعور پاکیزہ ہو جائے گا تو اس کے آثار یعنی وہ اعمال جو اس طرح کی حیات سے سرزد ہوں گے، سبھی طیب و طاہر اور صالح ہوں گے، (پہلا مرحلہ وہ ہے جس میں طیب کا مطلب گناہ و شرک اور کفر سے پاک ہونا ہے یعنی ایمان و عمل صالح کا حامل ہونا ہے اور دوسرا مرحلہ وہ جس میں معائب و نقائص سے طیب و طاہر ہونا ہے، یعنی تمام حسی محدودیتوں سے بالاتر پوری ہستی و شعور میں نافذ ارادہ و طاقت کا نفوذ)۔

''یہی وجہ ہے کہ سورۂ انعام کی ابھی تھوڑی دیر پہلے پیش کی جانے والی آیت میں اس کی نور سے تعبیر کی گئی ہے اور اسی طرح یہ آیت کہ جس میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[۱] سورۂ انعام، آیت: ۱۲۲۔

[۲] سورۂ نحل، آیت: ۹۷۔

{يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِن رَّحْمَتِهِ وَيَجْعَل لَّكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ}[1]

اے ایمان لانے والو! تقوائے الٰہی اختیار کرو اور خدا کے رسول پر اعلیٰ درجہ کا ایمان لاؤ تا کہ خدا تمہیں اپنی رحمت سے دو پروں کو عنایت کرے اور تمہارے لئے ایک ایسا نور قرار دے کہ جس کے تحت اپنی راہ وروش اور زندگی کو جاری رکھ سکو۔

''یہ حیات، ایک ایسی معزز اور کریمانہ اور مخصوص زندگی پر مشتمل ہے کہ جس کے آثار بہت ہی خاص اور انسان کی ابدی سعادت کے ہمراہ ہیں۔ یہ حیات مؤمن وکافر کی مشترکہ زندگی سے الگ اور مختلف ہے۔ بنابریں، اس زندگی کا خاص مبداء ہے اور وہ ایمانی روح ہے کہ جسے آیہ شریفہ مؤمن وکافر کے درمیان مشترکہ روح سے علیحدہ روح بتارہی ہے۔''[2]

انسان کے اندر روح کا وجود

حضرت ابی جعفر اور ابی عبداللہ (پانچویں وچھٹے امام) علیہما السلام سے آیہ ''يَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ'' کے بارے میں پوچھا گیا تو دونوں حضراتؑ نے جواب میں فرمایا:

خداوند عالم احد وصمد ہے اور صمد کا مطلب ہے کسی چیز کا بغیر غلاف کا ہونا یا خالی ہونا ہے، بنابریں روح، مخلوقات عالم میں سے ایک مخلوق ہے کہ جس کی آنکھیں اور تائیدی طاقت ہے اور اسے خداوند عالم نے ابنیاء اور مؤمنین کے دلوں میں جگہ دی ہے۔''[3]

علامہ اس حدیث کی وضاحت میں تحریر کرتے ہیں:

---

[1] سورۂ حدید، آیت: ۲۸۔

[2] المیزان، ج: ۱۳، ص: ۳۴۰ تا ۳۴۲۔

[3] المیزان، ج: ۱۳، ص: ۳۴۰، ۳۴۲۔

''اگر ابتداء میں اس روایت کے صمد اور احد کے معنی پر اعتراض کیا گیا ہے تو اس وجہ سے ہے کہ اعتراض کرنے والوں نے سوچا کہ ممکن ہے کہ ''وَنَفَخۡتُ فِيهِ مِن رُّوحِي'' کے جملہ سے یعنی میں نے اس میں، اپنی روح پھونکی سے، وہم پیدا ہو لہٰذا اس تعبیر کے غلط مفہوم پہنچانے کے سلسلہ میں غلط فہمی سے روک تھام کی جائے کیوں کہ اس تعبیر سے کسی کے بھی ذہن میں وہم پیدا ہو سکتا ہے کہ خداوند عالم بھی ہماری طرح پیکر جسمانی اور بدن میں پھونکی ہوئی روح کی طرح ہے۔

کافی نے اپنی سند میں ابان بن تغلب کے حوالے سے حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت نقل کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

''کوئی بھی مؤمن ایسا نہیں ہے کہ جس کے قلب کے باطن میں دو ۲ کان نہ ہوں کہ ان دو کانوں میں سے ایک کان میں شیطان ہمیشہ شک اور وسواس ڈالتا رہتا ہے اور دوسرے کان میں خدا کا فرشتہ اچھی باتیں گوش گزار کرتا رہتا ہے اور خداوند عالم اپنے فرشتہ کے ذریعہ مؤمن بندے کی تائید کرتا رہتا ہے اور یہ وہی چیز ہے کہ جس کے بارے میں خداوند عالم فرماتا ہے:

''وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنۡهُ''۔[1]

''اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے جو یہ کہنا چاہتی ہو کہ روح کا مطلب فرشتہ ہے بلکہ یہ کہنا چاہتی ہے کہ فرشتہ ہمیشہ روح کے ساتھ ہے اور اس کا سروکار اس کے ساتھ ہے جیسا کہ قرآن نے بھی فرمایا کہ خدا ہمیشہ فرشتہ کو روح کے ساتھ نازل کرتا ہے:

{يُنَزِّلُ الۡمَلَآئِكَةَ بِالرُّوحِ مِنۡ أَمۡرِهِ}[2]

''ابن خدیجہ نے روایت کی ہے کہ میں ابی الحسن علیہ السلام کے پاس حاضر ہوا تو انہوں نے مجھ سے فرمایا:

---

[1] المیزان، ج: ۱۳، ص: ۲۹۵۔

[2] سورۂ نحل، آیت: ۲۔

خداوند عالم مؤمن کی تائید ایسی روح کے ساتھ کرتا ہے جو کہ ہمیشہ ہی ہر نیک عمل کے ساتھ اس کے پاس آتی ہے اور جب کبھی برے اعمال سرزد ہوتے ہیں یا یہ اپنی حد سے تجاوز کرتے ہیں تو ان اعمال سے پرے ہٹ جاتی ہے۔ جب کوئی مؤمن اچھے اعمال انجام دیتا ہے تو بہت خوش ہوتی ہے اور گناہ نیز برے اعمال کے موقع پر وہ زمیں دوز ہوجاتی ہے۔"

اب جب کہ ایسا ہے تو اے خدا کے بندو! اس کی عطا کردہ نعمتوں کی قدر کرو اور اسی کے ساتھ اپنے دلوں کی اصلاح کرو تا کہ تمہارے یقین میں اضافہ ہو اور بیش قیمتی فائدے اٹھا سکو، خدا کی رحمت نازل ہو ان لوگوں پر کہ جو عمل خیر کا ارادہ کر کے اسے انجام دیں اور جب وہ برے اعمال کے ارتکاب کا فیصلہ کریں تو ان سے چشم پوشی کر لیں۔ اس کے بعد فرمایا:

"ہم خدا کی اطاعت اور خدا کی خاطر عمل کے لئے اپنے ایمان کی روح کی مدد اور تائید کرتے ہیں۔"[1]

بے پایاں سرچشمہ

مطلق روح، ہستی و حیات کا بے پایاں سرچشمہ ہے کہ جس کی فیاضی سے عالم ہستی مستفید ہوتی ہے اور یہ سب بحکم خداوندی انجام پاتا ہے۔ مطلق روح خداوند عالم کا وہی لا متناہی خزانہ ہے کہ جس کی بابت خدا نے فرمایا ہے:

{وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ}[2]

اور یہ کچھ اور نہیں ہے، یہ وہی سرچشمہ ہے جو ہمارے پاس ہے اور اس سے ہم نازل نہیں کرتے ہیں مگر یہ کہ بہت معلوم و محدود مقدار میں!

---

[1] المیزان، ج:۱۹، ص:۲۴۳ بنقل از اصول کافی، ج:۱، ص:۲۶۸۔

[2] سورۂ حجر، آیت:۲۱۔

آیۂ شریفہ میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ خداوند عالم کے پاس ہر موجود مخلوق کے لئے بقدر وسیع و غیر محدود اس کا خزانہ پایا جاتا ہے، تاہم جب اسے دنیا کے لئے نازل کیا جاتا ہے تو، محدود و معین کر دیا جاتا ہے، انسان بھی ایک مخلوق خدا ہے کہ اس کے خزانے میں سے اس کا بھی حصہ معین ہے اور دنیا میں نازل ہونے کے بعد یہ خزانہ محدود و منحصر حیثیت و مقدار حاصل کر لیتا ہے۔

اس آیۂ شریفہ میں اس کی مثال پیش کی گئی ہے:

{إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئاً أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ}[1]

اور اسی طرح یہ آیت بھی ہے:

{وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ}[2]

اسی طرح اس جیسی دیگر آیات کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ مخلوقات منجملہ انسانوں کا تدریجی وجود خدا کی جانب سے ایسا امر ہے جو کہ کلمۂ ''کن'' کے ذریعہ وجود میں آیا اور اس میں عدم تدریج کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے اور اس وجود مخلوق کے دو پہلو ہیں ایک وہ جو براہ راست خدا سے متوجہ ہے اور دوسرا پہلو دنیا کی جانب توجہ رکھتا ہے۔

''اس کا حکم جو کہ دنیا کی طرف متوجہ ہے، یہ ہے کہ تدریجی طور پر قوۃ سے فعل اور عدم سے وجود میں آتا ہے۔ ابتداء میں تو بطور ناقص ظاہر ہوتا ہے اور پھر دائمی طور پر مکمل ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس دنیا سے رخت سفر باندھ کر خدا کی جانب واپسی اختیار کرتا ہے لیکن یہی وجود مخلوق کہ جس کا پہلو خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے غیر تدریجی امر ہوتا ہے جو کہ اپنی ابتداء کے وجود کو لئے ہوئے ہوتا ہے اور اس کے اندر اتنی قدرت و طاقت

---

[1] سورۂ یٰس، آیت: ۸۴۔

[2] سورۂ قمر، آیت: ۵۰۔

نہیں ہوتی کہ وہ فعلیت کی طرف گامزن ہو سکے۔''

''یہ دونوں پہلو جو باوجود اس کے کہ ایک ہی شئے کے لئے ہیں لیکن ان کے احکام مختلف ومتفاوت ہیں''۔

''مذکورہ بالا آیت کا تقاضا یہ ہے کہ عالم انسانی کے لئے اپنی تمامتر وسعتوں کے باوجود خداوند عالم کے نزدیک جمعی وجود ہو اور یہ جمعی وجود وہی ہے جس کے بارے میں ہم نے کہا کہ ہر چیز کے وجود کا ربط خداوند عالم سے رہے (اور وہ بلا واسطہ اور عدم حجاب ہے) کہ جس کا اضافہ خداوند عالم نے تمام افراد پر کیا ہے اور اس کے اندر کوئی بھی فرد غائب نہیں ہے اور اسی طرح افراد اور خدا ایک دوسرے سے غائب واجنبی نہیں ہیں کیوں کہ فعل کا فاعل سے غائب ہونا اور صنع کا صانع سے علیحدہ ہونا معقول نہیں ہے اور یہ وہی حقیقت ہے کہ جس کو خداوند عالم نے ملکوت کا نام دیتے ہوئے فرمایا ہے:

{وَ كَذٰلِکَ نُرِیٓ إِبْرَاهِیمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ}[1]

ہم نے اس طرح سے ابراہیم کے لئے آسمانوں اور زمین کے ملکوت کی نشاندہی کرائی تا کہ اہل یقین میں سے ہوں۔

اور اس آیۂ شریفہ میں ارشاد ہوتا ہے:

{كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ}[2]

اگر تم علم یقین سے آگاہ ہوتے تو قسم ہے کہ جہنم کو دیکھ لیتے اور بصیرت بین نگاہوں چشم یقین سے اس کو دیکھ لیتے۔

لیکن دنیاوی انسان کا یہ رخ اور پہلو کہ جس کا ہم مشاہدہ کرتے آئے ہیں، انسانی افراد

---

[1] سورۂ انعام، آیت:۷۵۔

[2] سورۂ تکاثر، آیت:۷۔

اور ان کے اعمال واحوال، زمانے کے طبقات اور درجوں میں تقسیم شدہ ہیں جو کہ زمانے کے گذرنے کے ساتھ روز وشب سے ہماہنگی کئے ہوئے ہیں اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ انسان زمینی مادی خواہشات اور حسی لذائذ کی خاطر اپنے پروردگار سے دور ہو چکا ہے (خدا اور بندے کے درمیان حجاب آچکا ہے) یہ سبھی حالات زندگی کے دوسرے رخ اور پہلو کا نتیجہ ہیں کہ جن کے بارے میں ہم نے اشارہ کیا کہ وہ اس زندگی سے پہلے ہے نیز یہ زندگی اُس زندگی کے بعد ہے اور اِس دنیا نسبت اُس دنیا سے، جملہ ''اَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ'' میں ''کُن وَیَکُون'' کی نسبت کی طرح ہے۔[1]

''خداوند عالم کے کلام سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ لوگوں کی اس زندگی سے قبل ایک اور زندگی اور دنیا تھی جو کہ اس دنیا میں وہ اپنی پچھلی زندگی سے تینوں حیاتوں (یعنی اس دنیا کی زندگی سے پہلے کی زندگی، دنیاوی زندگی اور آخرت کی زندگی) سے سبق حاصل کرتا ہے۔''

''واضح لفظوں میں یہ کہ انسان، اس دنیا کی زندگی سے پہلے، دوسری زندگی جیتا تھا اور اس دنیا کے بعد بھی اس کی دوسری زندگی ہوگی اور اس زندگی کے تیسرے مرحلہ میں بھی وہ دوسری زندگی کے آثار اور حکم کے تابع ہے (اور دنیا کے اعمال اور عقائد کے نتائج کو آخرت میں دیکھے گا) اور دوسری زندگی، پہلی زندگی کے حکم کے تابع ہے، بنابریں جو انسان اس دنیا میں ہے وہ دو زندگیوں کے درمیان واقع ہے۔ ایک تو موجودہ سے پہلی والی اور دوسری اس کے بعد والی اور آنے والی، یہ وہی مطلب ہے کہ جس کو ہم قرآن کے ظاہر سے سمجھتے ہیں۔''[2]

---

[1] المیزان، ج:۸،ص:۲۱۶، ۲۱۸۔

[2] المیزان، ج:۱،ص:۱۴۴۔

اس آیت میں تھوڑا سا غور کریں گے تو مطلب واضح ہو جائے گا

{وَ إِذْ أَخَذَ رَبُّکَ مِن بَنِیْ آدَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ أَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنفُسِهِمْ أَلَسْتَ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى شَهِدْنَا}[1]

اور اس وقت (کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے ان کی اولادیں پیدا کیں اور انہیں ان پر گواہ قرار دیا اور فرمایا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ تو سب نے جواب دیا: ہاں، ہم گواہی دیتے ہیں... یہ آیت اس انسانی دنیا کی گواہی دیتی ہے کہ اس دنیا سے پہلے بھی دنیا ہے اور اس دنیا میں خداوند عالم نے نوع انسانی میں فرق قرار دیا اور ہر ایک کو ان کے نفس پر شاہد قرار دیا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ تو انہوں نے کہا: ہاں... جو بات ہماری اس آیت اور دیگر آیتوں کے مفہوم سے سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا تقدم اس دنیا پر زمانی (زمانہ کے اعتبار سے) نہیں ہے۔ وہ عالم، زمانہ اور موقع کے حساب سے دنیا سے کوئی بھی جدائی نہیں رکھتا ہے بلکہ اس کے ہمراہ اور اس پر محیط و مشتمل ہے اور جو تقدم اس دنیا پر ہے وہ "کن فیکون" کے تقدم کی مانند ہے۔"[2]

دیرینہ عہد کی حقیقت

"وَ إِذْ أَخَذَ رَبُّکَ..." یعنی لوگوں کو عہد و پیمان کی یاد دلاؤ کہ خدا کے لئے ایک عہد و پیمان ہے جو انسانوں کی گردن پر رکھا گیا ہے کہ جس کے تحت وہ لوگوں سے باز خواست کرے گا لیکن زیادہ تر لوگ اس حجت کی جو کہ ان کے لئے تمام کردی گئی ہے، پرواہ نہیں کرتے اور اپنا عہد نہیں نبھاتے ہیں۔

"لوگوں کو اس وطن کی یاد دلاؤ کہ جہاں پر خداوند عالم نے ان کو اصلاب سے اس

---

[1] سورۂ اعراف، آیت: ۱۷۲۔

[2] المیزان، ج:۸، ص:۴۱۸۔

طرح نکالا کہ ان میں سے کوئی باقی نہیں بچا مگر یہ کہ ایک دوسرے سے بالکل الگ اور مستقل و معین تھے اور اس وطن میں سب لوگ علیحدہ طور پر مجتمع ہوئے اور خداوند عالم نے ان کے پروردگار سے وابستہ ذات وہستی کی نشاندہی کرادی اور ان کو ان کے ہی اوپر گواہ قرار دیا اور وہاں پر ان کے اور ان کے پروردگار کے درمیان کوئی پردہ وحجاب حائل نہیں تھا بلکہ انہوں نے بامعائنہ وبالمشاہدہ اسی طرح دیکھا کہ وہ ان کا پروردگار ہے کہ جس طرح ہر مخلوق وموجود اپنی فطرت اور ذات کے تحت اپنے پروردگار کو پالیتی ہے بغیر اس کے کہ ان کے درمیان کوئی پردہ وحائل موجود ہو۔

اور یہ مطلب بعض دیگر آیات کی مانند، اس آیت میں ظاہر ومشہود ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ "وَاِنۡ مِنۡ شَيۡءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ وَلٰكِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِيۡحَهُمۡ" کوئی بھی شئے ایسی نہیں ہے جو اس کی ستائش اور حمد وثناء میں مشغول نہ ہو، البتہ (یہ اور بات ہے کہ) تم لوگ اس کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے ہو"۔[1]

"اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ قَالُوۡا بَلٰى شَهِدۡنَا" یہ خطاب اور جواب زبان حال نہیں ہے بلکہ خدا کا حقیقی وکلامی خطاب ہے، (لیکن پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ) پھر کلام کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کلام کچھ ایسے القاءات ہیں جو کہنے والے کے مورد نظر معنی پر دلالت کرتے ہیں اور خداوند عالم نے انسان کے ضمیر پر کچھ القاءات وارد کئے ہیں اور انسان اس سے خدا کے مفہوم کو سمجھ گیا ہے کہ اسے خداوند عالم کی ربوبیت کا اعتراف کرنا ہی چاہیئے۔[2]

اسی آیت میں آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

"اَنۡ تَقُوۡلُوۡا يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنۡ هٰذَا غٰفِلِيۡنَ"

یعنی ان لوگوں کو یاد دلاؤ کہ جن سے ہم نے ایسا عہد لیا ہے کہ بروز قیامت یہ نہ کہہ سکیں

---

[1] سورۂ اسراء، آیت: ۴۴۔

[2] المیزان، ج:۸، ص: ۴۲۰۔

کہ ہم اس (عہد) سے غافل و بے خبر تھے۔

''اس جملہ کا خطاب ''اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ'' کے سبھی مخاطبین سے ہے اور یہ وہی لوگ ہیں کہ جنھوں نے کہا تھا کہ ''بَلٰی شَهِدۡنَا'' بنابریں یہ آیت، اس بات کی نشاندہی کراتی ہے کہ انسان قیامت کے دن، خدا کے خطاب، عہد و پیمان اور اپنی گواہی کو دیدار حقیقی کے موقع پر دیکھے گا اور بروز قیامت دنیاوی بساط کے پلٹ جانے کے بعد دنیاوی غفلت ختم ہو جائے گی اور انسان اپنی اصلیت کی جانب لوٹ آئے گا۔ وہ پھر سے حقائق کا مشاہدہ کرے گا اور جو کچھ اس کے اور اس کے پروردگار کے درمیان واقع ہوا ہے، ظاہر ہو جائے گا۔

عالم ذر کے سلسلہ میں روایات

''علی بن ابی طالب علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے:

جب ابن الکواء نے حضرت کے پاس آکر عرض کی کہ:

اے امیر المؤمنین خداوند عالم کے بارے میں مجھے بتائیں کہ کیا جناب موسیٰؑ سے پہلے، کسی انسان سے خدا نے کلام کیا تھا؟

حضرتؑ نے جواب میں فرمایا:

خداوند عالم نے اپنے سبھی بندوں سے چاہے وہ اچھے ہوں یا برے، کلام کر چکا ہے اور سب ہی اس کا جواب دے چکے ہیں۔''

ابن الکواء امام علی علیہ السلام کی بات کا مفہوم نہ سمجھ پایا، پوچھا: وہ کیسے؟ حضرتؑ نے جواب دیا: کیا تم نے خدا کی کتاب نہیں پڑھی ہے کہ جس میں اللہ نے اپنے پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے: جب تمہارے پروردگار نے اپنے بندوں کو منتخب اور ان کے فرزندوں کو بھی ان کے بعد منتخب کیا اور انہیں کو خود ان کا گواہ قرار دیا اور پوچھا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ تو سبھی نے جواب دیا کہ ہاں...

''اگر تم نے اس آیت کو پڑھا ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ خداوند عالم نے تمام انسانوں کو اپنا کلام سنوایا ہے اور انہوں نے بھی اس کا جواب دیا ہے۔

اے ابن کوا! جملہ قَالُوا بَلٰی بنی آدم کا جواب ہے، خداوند عالم نے بنی آدم سے فرمایا: یقیناً میں معبود یکتا ہوں اور میرے سواء کوئی معبود نہیں ہے، میں رحمان و رحیم ہوں بنابریں انہوں نے اطاعت و ربوبیت کا اقرار کیا پھر انبیاء اور ان کے اوصیاء کو دوسروں سے علیحدہ کرتے ہوئے بشر کو ان کی اطاعت کے لئے مقرر کیا اور انسان نے بھی عہد ازل میں ان ساری باتوں کا اعتراف کیا۔''

''جب وہ اقرار کر رہے تھے تو ملائکہ نظارت کر رہے تھے اور انہوں نے کہا تھا: اے بنی آدم! ہم اس بات کے گواہ ہیں تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ اس بات سے ہم بے خبر تھے۔''[1]

علامہ اس روایت کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

''ایسا لگتا ہے کہ ذرے سے ذرّیہ کی تشبیہ جو کہ بعض روایات میں آئی ہے اس میں ذریہ کی کثرت کو سمجھانا مقصود ہے نہ کہ انفرادیت کو اور نہ یہ کہ چھوٹے ہونے کی وجہ سے اور نہ ہی اس سے ہے کہ جسم کے لحاظ سے چھوٹے یعنی ذر تھے بلکہ اس بات کے پیش نظر کہ اس تعبیر کا استعمال بہت سی روایات میں مکرر طور پر ہوا ہے کہ اُس دنیا کو عالم ذر کا نام دیتے ہیں۔''

''یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ سوال و جواب حقیقی گفتگو پر مبنی تھے نیز یہ کہ مذکورہ عہد و پیمان پروردگار کی ربوبیت کے متعلق نہیں لیا گیا ہے بلکہ اقرار نبوت اور

---

[1] المیزان، ج:۸، ص:۳۲۲، از تفسیر عیاشی، ج:۲، ص:۴۱۔

دیگر برحق عقائد بھی اس پیمان کا حصہ رہے ہیں اور اسی پر دلالت کرتے ہیں۔"[1]

"عبداللہ بن سنان نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا:

وہ کون سی فطرت ہے کہ جس کے بارے میں قرآن مجید کی اس آیہ شریفہ "...فِطْرَةَ اللهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا "میں فطرت کا تعارف کرایا گیا ہے؟"

امام عالی مقام نے ارشاد فرمایا: وہ اسلام ہے کہ خداوند عالم جب لوگوں سے توحید کی بابت عہد و پیمان بندھوا رہا تھا اس وقت اس نے مؤمن اور کافروں دونوں سے کہا: "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟

اللہ نے انسانوں کو اسلامی فطرت کی بنیاد پر خلق کیا۔[2]

"رفاعہ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے آیہ "وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِی آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ " کا مطلب دریافت کیا تو حضرتؑ نے فرمایا: ہاں، خدا کے لئے سب پر اتمام حجت ہے، ایسے دن جب اس نے لوگوں سے عہد لیا پھر حضرتؑ نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور فرمایا: اس طرح سے!"[3]

علامہ نے ذیل میں عالم ذر سے متعلق ایک روایت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے تا کہ ذیل کی ظاہری آیت میں جو شبہات ظاہر ہوں اسے مرتفع کر دے۔ چوں کہ اس آیت میں وارد ہوا ہے کہ خداوند عالم نے فرزندان بنی آدم کو ان کی پشت سے نکالا، ممکن ہے کہ کوئی یہ سوچے (جیسا کہ کچھ لوگوں کی جانب سے یہ غلط فہمی معرض وجود میں آئی ہے) کہ اس آیت سے مراد آدم علیہ السلام کے صلب میں انسانوں کے نطفہ کی موجودگی ہو۔

---

[1] المیزان، ج:۸، ص:۴۲۴۔

[2] المیزان، ج:۸، ص:۴۲۱، از کافی، ج:۲، ص:۱۲۔

[3] المیزان، ج:۸، ص:۴۲۳، از تفسیر عیاشی، ج:۲، ص:۳۷۔

علامہ فرماتے ہیں: وہ روایت جو ابی بصیر نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے حوالے سے پیش کی ہے اور عیاشی نے اس کو نوٹ کیا ہے، فرمایا:

''خدا نے رسولوں کو اپنی مخلوق کی طرف بھیجا جب کہ مخلوق باپ کے صلب میں اور ماں کے رحم میں موجود تھی....''

یہ ایسی روایت ہے کہ عقل کا بدیہی و ظاہری حکم اس آیت کے مضمون کو مسترد کرتا ہے۔ کیونکہ یہ ان معنوں میں ہے کہ انسانوں کا نطفہ جو کہ باپ کی پشت میں اور رحم مادر میں ہے اس میں حیات کے ساتھ عقل و فریضہ کا بھی وجود پایا جاتا ہے اور ضرورتاً ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے... پس یہ حدیث علی الظاہر قابل قبول نہیں ہے، مگر یہ کہ دوسرے معنی میں پلٹا لیں۔ مثلاً یہ کہنا چاہتے ہیں:

عالم ذر اس عالم مادی پر مشتمل ہے لیکن زمانی تدریج کے ساتھ کیوں کہ وہ عالم زمانی نہیں ہے اور اُس عالم کی موجودات کی موجودگی کا تعلق یہاں کے زمانے اور وہاں کے زمانے سے وابستہ نہیں ہے۔''[1]

ابن مسکان کہتے ہیں میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ گواہی کا لینا جو کہ اس آیت، ''وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی''میں ذکر ہوا ہے، کیا حقیقی طور پر دیکھنے کی نشاندہی کرتا ہے؟

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

ہاں، لیکن عوام نے اسے بھلا دیا ہے۔ لیکن پھر بھی اصل معرفت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے اور بہت جلد اس کو حاصل بھی کرلیں گے اور اگر معرفت بھی ختم ہوجاتی تو ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں سمجھ پاتا کہ ان کا خالق اور رازق رساں کون ہے؟

---

[1] المیزان، ج:۸، ص:۱۵۵۔

''جو لوگ اس دنیا میں کافر ہو گئے وہ (درحقیقت) اُس دنیا میں ایمان نہیں لائے اور باوجودیکہ ان کا دل آگاہ ہوگیا اور زبان پر کلمات جاری ہوئے، لیکن عمل میں وہ پیچھے رہ گئے اور ناکام رہے۔ خداوند عالم نے ان کے حق میں فرمایا:

''فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ''

اس چیز پر ایمان نہیں لائے کہ جس کی پہلے ہی تکذیب تردید کر دی تھی۔''[1]

ایک آدمی نے حضرت ابی جعفر علیہ السلام سے آیۂ ''وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ...'' کے بارے میں پوچھا تو حضرتؑ نے ایسی حالت میں جب کہ آپؑ کے والد محترم بھی آپؑ کے پاس بیٹھے تھے، فرمایا: میرے والد نے مجھے بتایا ہے کہ خداوند عالم ایک مٹھی مٹی کہ جس سے آدم کو خلق کیا تھا انتخاب کیا اور اس پر میٹھا اور خوشگوار پانی ڈالا اور چالیس دنوں تک اسی حالت میں برقرار رکھا، جب وقت پورا ہو گیا تو اس کو اٹھایا اور خمیر کیا تب اس کے داہنے اور بائیں سمت سے بنی آدم کی ذریت پیدا ہوئی، پھر حکم دیا کہ سبھی آگ میں چلے جائیں، اصحاب یمین (نیکوکار لوگ) داخل ہو گئے اور وہ آگ ان کے لئے ٹھنڈی اور نرم ہو گئی لیکن اصحاب شمال (برے لوگوں) نے اس میں جانے سے گریز کیا۔[2]

''اسی سے مربوط مطلب کو بیان کرتی ہوئی دوسری روایت بھی ہے جو آگ میں داخل ہونے کے حکم کو گویا کہ بندگی و دل سپردگی کی وادی میں داخل ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔''[3]

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

---

[1] المیزان، ج:۸، ص:۲۳۱ از تفسیر قمی، ج:۱، ص:۲۴۸۔

[2] المیزان، ج:۸، ص:۲۳۱ از کافی، ج:۲، ص:۷۔

[3] المیزان، ج:۸، ص:۲۳۲۔

''خداوند عالم نے مخلوق کو پیدا کیا، اس طرح کہ اس نے اپنے چاہنے والوں کو ایسی چیز سے خلق کیا کہ جسے وہ خود پسند کرتا تھا اور وہ بہشت کی مٹی تھی اور دشمنوں کو ایسی چیز سے خلق کیا کہ جس کو وہ پسند نہیں کرتا تھا اور وہ دوزخ کی مٹی تھی، پھر ان دونوں کو ملکوت کے سائے میں مبعوث کیا۔ کسی نے پوچھا کہ یہ سایہ کیا ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ سورج کی شعاعوں کے موقع پر تمہارا سایہ کچھ ہوتا ہے حالانکہ وہ کچھ نہیں ہوتا، پھر ان کے لئے اپنے نبی بھیجے اور انبیاء نے انہیں خدا کی دعوت دی اور یہ وہی کلام خدا ہے جس میں اللہ نے فرمایا ہے:

''وَلَئِنۡ سَأَلۡتَهُمۡ مَنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰاتِ وَالۡاَرۡضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ''

اگر تم ان سے پوچھو کہ انہیں کس نے خلق کیا ہے تو وہ بے جھجک کہیں گے کہ خدا نے پیدا کیا ہے۔

''پھر ان سے مطالبہ کیا گیا کہ اس کی (خدا کی) ربوبیت کا اقرار کریں، لیکن کچھ نے تو اقرار کیا اور کچھ نے انکار کر دیا، پھر ان کو ہماری ولایت کی دعوت دی گئی، خدا کی قسم ان لوگوں نے قبول کر لیا کہ جنہیں خدا دوست رکھتا تھا اور جو لوگ خدا کے محبوب نہ تھے انہوں نے منہ پھیر لیا اور یہ وہی کلام خدا ہے جس میں فرمایا ہے کہ ''فَمَا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡا بِمَا كَذَّبُوۡا مِنۡ قَبۡلُ''۔[1]

''حضرت امام ابی جعفر علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

جب خداوند عالم مخلوق کو وجود میں لا رہا تھا اس وقت سب سے پہلے اس نے میٹھا، خوشگوار اور کھارا پانی خلق کیا پھر ان دونوں کو آپس میں ملایا اور پھر زمین سے مٹی اٹھائی اور اس کو خوب گوندھا، پھر اصحاب یمین اور صالحین سے جو کہ اس وقت اس کے پہلو جاندار ذرّات کی شکل میں حالت حرکت میں تھے، فرمایا:

جنت کی جانب جاؤ کہ میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا اور پھر نا پاکوں اور اصحاب شمال

[1] المیزان، ج:۸،ص:۴۴۴، از کافی، ج:۲،ص:۱۲۔

سے فرمایا کہ تم دوزخ کی طرف جاؤ کہ اس بابت میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا، پھر پوچھا:

کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ سب نے کہا کہ ہاں ہم گواہی دیتے ہیں تا کہ بروز قیامت یہ نہ کہیں کہ ہم غافل تھے....''[1]

حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام سے روایت کی گئی ہے کہ دونوں اماموں نے فرمایا:

خداوند عالم نے مخلوق کو پیدا کیا، جب کہ وہ صرف سایہ تھے، پھر اسی حالت میں اپنے رسول محمدؐ کو بھیجا۔ جہاں کچھ نے ان پر ایمان قبول کیا اور کچھ نے ان کی تردید کی۔ پھر دوسری خلقت میں آنحضرتؐ کو (جو کہ یہی عالم مادی ہے) مبعوث کیا، اس دنیا میں انہی لوگوں نے ان پر ایمان قبول کیا کہ جنہوں نے سایوں کی دنیا (عالم اظلّہ) میں ایمان قبول کیا تھا اور ان لوگوں نے یہاں بھی انکار کیا کہ جنہوں نے اُس دنیا میں نبوت کا انکار کیا تھا اور آیۂ شریفہ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتی ہے:

{فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا بِهِ مِن قَبْلُ}[2]

آیۂ ذریا الست، آیۂ تکذیب کے ساتھ ظاہری تعارض وٹکراؤ کو ثابت کرتی ہے اور شاید یہ معلوم نہ ہو سکے کہ آخر سبھی انسانوں نے خدا کے سوال پر مثبت جواب دیا یا نہیں یا اس کی تردید و تکذیب کی کہ خداوند عالم اپنے پیغمبرؐ سے فرماتا ہے کہ خود کو پریشانی اور رنج میں مت ڈالو کیوں کہ جو لوگ اِس سے پہلے ایمان نہیں لائے ہیں وہ اب بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

لیکن جو روایات ذکر ہوئیں ان سے کسی حد تک دونوں آیتوں کا مطلب واضح ہوتا ہے اور وہ مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم نے پہلے تو انسانوں سے اپنی ربوبیت کا اعتراف کروایا اور

---

[1] المیزان، ج:۸، ص:۳۲۱، از اصول کافی، ج:۲، ص:۸۔

[2] سورۂ یونس، آیت: ۷۴۔

انہیں، انہیں پر گواہ قرار دیا ہے اور پھر اُسی دنیا میں پیغمبر کو مبعوث کیا اور انسانوں کو آزمایا اور جن لوگوں نے اس کو اور اس کے پیغمبر کو جھٹلایا وہ غافل اور عہد توڑنے والوں میں سے ہیں کہ جنہوں نے اس دنیا میں عصیان و گناہ کیا اور اس گناہ کے ارتکاب اور حق کی نافرمانی کے سبب انہیں کھولتا ہوا پانی اور پیپ پلایا جائے گا۔

علامہ آخری روایت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''...اس روایت کی خاص خصوصیت اور وہ ''سایہ'' کی لطیف تعبیر ہے کہ اگر اچھی طرح سے غور کیا جائے تو اس کا مقصد واضح تر ہوتا جائے گا۔

''اس دنیا کی مخلوقات میں کچھ ایسے امور ہیں کہ جو کسی لحاظ سے اشیاء کے سایہ سے شباہت رکھتے ہیں اور سایہ کی مانند اشیاء کے ہمراہ رہا کرتے ہیں اور وہ اشیاء کے وجود کے خصوصیات و آثار کی نشاندہی کرتے ہیں اور اسی حالت میں وہ اس کا عین (وجود) ہیں بھی اور نہیں بھی ہیں۔''

اس لئے کہ جب ہم اشیاء پر نظر ڈالتے ہیں اور اپنی نظروں کو خالص کر کے اشیاء کو صرف اس لحاظ سے دیکھتے ہیں کہ یہ خدا کی بنائی ہوئی اور اس کے ذریعہ صادر کردہ فعل محض ہیں اور اس سے علیحدہ نہیں ہیں (کہ البتہ حق اور واقعی نظر و دید بھی یہی ہے) ایسی نظر میں اشیاء میں ہم کچھ نہیں دیکھتے ہیں سوائے اس کے کہ وہ حضور خدا میں تسلیم اور خضوع و ذلت پسندی و حقارت اس کی موجود کبریائی کے مقابلہ میں خاشع و خاضع نظر آتی ہیں اور ان سب کا واسطہ اور رابطہ اللہ کی رحمت و ربوبیت سے ہوتا ہے جو کہ اس کی وحدانیت کے قبول کرنے کے ساتھ اس کے رسولوں اور اس چیز پر جو کہ وہ لے کر آئے ہیں ایمان رکھتے ہیں۔

''اس طرح کے خصوصیات، ان موجودات کی طرح ہیں جو اشیائے عالم کے لئے سائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

''البتہ یہ اس وقت ممکن ہے جب ہم مادّی اشیاء پر نظر کریں اور عالم مادّہ کو اصل اور معیار قرار دیں (اور اس دنیا کے جھروکے سے ملکوتی حقائق کے بارے میں غور وفکر کرنے کی کوشش کریں اور اس بابت گفتگو کریں) قرآنی آیات نے بھی کہ جن کا مقصد الٰہی ذمہ داری کے ثبوت کا بیان کرنا ہے اور اس کے مخاطب بھی عام انسان ہیں، اپنے بیان کی بنیاد اسی کو قرار دیا ہے۔''

''لیکن اگر موجودات کو اوپر سے دیکھیں اور خدا سے ارتباط کے لحاظ سے نظر ڈالیں اور اس لحاظ سے اصل اور معیار قرار دیں اور دنیا کی مادی مخلوقات وموجودات کا اُس دنیا سے موازنہ کریں (کہ یقیناً اس لحاظ سے یہ نظریہ بھی حق بجانب اور حقیقت وواقعیت رکھتا ہے) تو ایسی نظر اور نگاہ سے یہ دنیا ایک سایہ نظر آئے گی اور موجودات میں خدا سے ربط کا پہلو، اصل شخصیت اور ان کی ہستی ووجود مادی چیزیں اور دنیا کا سایہ ہوں گی جیسا کہ مندرجہ ذیل دو آیتوں کے تحت اس کی طرف اشارہ ہوا ہے:

{كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ}[1]

زمین پر موجود ہر چیز کو فنا ہونا ہے اور پروردگار عالم کے جلال وکرامت کا چہرہ باقی رہنے والا ہے۔

{كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ}[2]

سب کچھ فنا ہو جانے والا ہے مگر اس کا چہرہ۔

بنابریں عالم ذر یعنی روح مطلق کے پاس ہمارا حاضر ہونا ہے۔

عالم ملکوت کی بہتر شناخت کے لئے جو کہ مطلق عالم روح ہے اور عہد الست نیز میثاق و

---

[1] سورۂ قصص، آیت: ۸۸۔

[2] المیزان، ج: ۱۰، ص: ۱۵۴۔

دیدار حق تعالیٰ، وہاں پر واقع ہو چکا ہے، ان دو تفاوت اور فرق کے بارے میں غور وخوض کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس فانی عالم مادہ کو اصل اور معیار و ملاک قرار دیں، جیسا کہ عام نظر میں ایسا ہی ہے تو پھر ملکوتی حقائق منجملہ عالم برزخ، ملائکہ، جنت و دوزخ، معنوی لذائذ اور ایمان و عمل صالح سب کے سب خواب اور سائے کی حالت اختیار کرلیں گے اور غیر حقیقی و غیر اصلی نظر آئیں گے۔ لیکن اگر ہمیں حقیقی جگہ اور قرب پروردگار کے حقیقی مقام و مرتبہ کا حصول ہو جائے تو پھر یہ دنیا بے معنی اور کھوکھلی نظر آئے گی اور سمجھ میں آجائے گا کہ باقی اور اصل حقیقت وہی ملکوت اور ملکوتی خلائق ہیں کہ جو ساری چیزیں اور موجودات رب العالمین اور اس کی کرامات و عنایات کے سہارے باقی ہیں۔ اس عالم ملکوت میں سبھی حقائق نورانی اور الٰہی ہیں جو کہ اسماء قدسیہ اور انوار الٰہیہ سے سرشار ہیں اور دوسرے جامع الفاظ میں یہ کہ وجہ خدا کا مطلب ذات باری تعالیٰ کی شگفتگی اور اس کا شدید طور پر آشکار ہونا ہے۔

اس لحاظ سے اس پست عالم مادی میں آنے سے پہلے، یہ سارے انسان ملکوت میں خداوند عالم کے حضور میں موجود تھے اور اس کو اس کی تمام عظمت و جلالت و جمال و اکرام کا مشاہدہ کیا کرتے تھے اور اس کی گواہی بھی دیتے تھے۔ بنابریں جو بھی اپنی معرفت نفس، خودی کی شناخت اور راہ ہستی کی تلاش میں کوشاں رہے گا وہ اس منبع اور مرکز تک پہنچ جائے گا اور جو کچھ اس کے ماسواء اور اس کے علاوہ ہے وہ نیست و نابود ہو جائے گا۔ البتہ اس بات پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ عالم ملکوت اس عالم مادہ سے جو کہ (ناسوت) ہے علیٰحدہ نہیں ہے بلکہ یہاں بھی حاضر ہے اور اس دنیا پر محیط و مشتمل ہے کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ دنیا ہی نہ ہوتی لیکن جاہل و غافل افراد اپنی چشم جہالت و غفلت سے صرف اپنے موہوم و خیالی مادی دنیا کو بطور مستقل دیکھتے ہیں۔

حالانکہ قرآن مجید کے مخاطبین عام سمجھ والے لوگ ہیں اور بادی النظر میں قرآن اپنا مخاطب عام لوگوں کو قرار دیتا ہے لیکن اس میں اشارات و تصریحات بھری پڑی ہیں جو کہ اہل

عرفان وعمل کے لئے بہت ہی گہری ودقیق سوچ کی دعوت دیتے ہوئے علم وعرفان کے آفاق کو روشن کرتا ہے۔

عرفانی نظریہ کی تردید

{لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ...}[۱]

اس کے سوائے کوئی دوسرا معبود نہیں ہے۔ سب موجودات ومخلوقات تباہ ہوجائیں گی سوائے اس کی صورت کے۔

''دو لفظ: وجہ اور جہت کا مطلب ایک ہے جیسے، ''وعد وعدۃ'' عرف عام میں ہر چیز کی وجہ اور صورت کا مطلب وہ حصہ ہوتا ہے جو اپنے غیر سے روبرو ہوتا ہے اور اس سے رابطہ پیدا کرتا ہے جیسے کسی بھی جسم کا سامنے کا حصہ یا چہرہ جو کہ اس بیرونی سطح کو تشکیل دیتا ہے اور انسانی وجہ یعنی اس کا چہرہ، سر اور صورت کا اگلا حصہ ہوتا ہے یعنی وہ حصہ جو لوگوں کے سامنے ہوتا ہے۔''

''وجہ خداوندی (خدا کا چہرہ) وہ ہے جو اس کی مخلوق کے لئے ظاہر ونمایاں ہے اور ہر مخلوق بھی اس کے ذریعہ سے اس کی بارگاہ کی جانب متوجہ ہوتی ہے اور وہ (چہرہ) اس کی صفات کریمہ منجملہ حیات وعلم، طاقت وقدرت اور بینائی وشنوائی کی طاقتیں ہیں۔''

نیز خدا کے فعلی صفات میں سے ہر صفت ہے جیسے کہ خلق ورزق، زندہ کرنا، مارنا، بخشش ومہربانی وغیرہ اور اسی طرح وہ آیات بھی وجہ خدا شمار ہوتی ہیں جو خداوند عالم کی معرفت کے اعتبار سے وجہ خدا ثابت ہوتی ہیں۔

''بنابریں ہر وہ موجود ومخلوق کہ جو خود تصور کی جائے، وہ ہلاک وباطل اور نابود ہونے والی ہے اور صرف وہی حقیقت باقی رہنے والی ہے جو کہ خدا کی جانب سے اسے فیضان

---

۱ سورۂ قصص، آیت: ۸۸۔

رسائی کرتی ہے اور جو کچھ اس سے منسوب نہ ہو مجموعی طور پر حقیقت سے خالی ہے اور وہ وہم سے بڑھ کر کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ جس کو وہم نے ہی تراشا اور بنایا ہے، یا ایسے سراب کی مانند ہے کہ جس نے حقیقت کا جلوہ دکھانے کی کوشش کی ہے...."[1]

ایسی حالت اس وقت پیش آئے گی جب آیہ شریفہ میں ہالک کا مطلب فعلی ہالک (ہلاک ہونے والا) ہے۔

"..... یہاں پر اس آیت کی تفسیر میں ایک اور صورت ہے جو سابقہ مسئلہ سے الگ اور دقیق تر ہے، اس بات پر بنا رکھتے ہوئے کہ وجہ" سے مراد ہر چیز کی ذات ہو جیسا کہ کچھ لوگوں نے کہا ہے 'اور اس کی مثال دی ہے کہ وجہ النہار اور وجہ الطریق سے یعنی خود روشن دن، خود راستہ اور فی الحال ہمیں اس پر بحث نہیں کرنی ہے۔"[2]

تو اس وقت جب انسان اپنے نفس کے مطالعہ کے بعد اپنی حضوری معرفت کے ذریعہ اپنی اپنے پروردگار کی معرفت حاصل کرتا ہے اور اپنے پورے وجود کو اس کے فیض سے فیضیاب پاتا ہے تو ایسے ہر چیز کو خدا کے ذریعہ پہچانتا ہے اور دنیا اس کی نظر میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ پوری دنیا میں خدا کا پھیلا ہوا نور مشاہدہ کرتا ہے۔

خودشناسی، پروردگار کی حضوری معرفت کی راہ

"آفاقی نشانیوں میں غور و فکر کرنا حصولی و استدلالی معرفت ہے لیکن نفس اور اس کی طاقتوں، مراحل اور عالم پر غور و فکر نیز آثار نفس کی تجلیوں پر غور کرنے سے شہودی و حضوری شناخت و معرفت حاصل ہوتی ہے۔

"حصولی علم کا حضوری علم سے فرق یہ ہے کہ علم و معرفت کا حصول دلیل و برہان اور

---

[1] روح المعانی، ج:۲۰، ص:۱۳۰۔

[2] المیزان، ج:۱۶، ص:۱۳۴ تا ۱۳۶۔

قیاس کو ترتیب دینے کا محتاج ہے اور حصولی معرفت کی پائیداری وثبات، ان تمہیدات و مقدمات پر مبنی ہے اور جب تک کہ یہ مقدمات ذہن میں نقش رہیں گے اور انسان اس سے غافل نہ ہوگا اس کا علم باقی رہے گا لیکن جیسے ہی اس کی توجہ ہٹے گی ایک ہلکا سا اور تنکا برابر شبہہ بھی اس معرفت کے پورے تانے بانے کو بکھیر کر رکھ دے گا لیکن معرفت اور حضوری علم ایسا نہیں ہے کیوں کہ اس علم سے مراد اپنے نفس سے آگاہ ہونا اور اس کے وجودی عوالم وقدرت سے واقفیت رکھنا ہے اور یہ علم مشاہدہ ومعائنہ جیسا ہے کہ جس کے لئے دلیل و برہان اور ذہنی تصویر وشکل کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔''

''جب انسان اپنے نفس کا مطالعہ کرتا ہے اور اپنے پروردگار سے مربوط اپنی ضروریات پر نظر ڈالتا ہے تو سمجھ میں آتا ہے کہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں وہ کس طرح سے محتاج ہے اور کن ضروریات کا نیاز مند ہے، اس کے بعد عجیب وغریب حقیقت سے روبرو ہوتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ یہ تو کبریائی عظمت سے مربوط ہے پھر وہاں ایک دوسرے وجود وحیات، علم وقدرت اور سماعت وبصارت اور محبت وارادہ کو پاتا ہے جو کہ بالکل الگ ہے اور وہ اپنے نفس کے تمام افعال وصفات کو بیکراں اور اتھاہ سمندر کا ایک قطرہ اور خرمن میں تنکے کے برابر پاتا ہے، یہاں تو ایک ایسا خزانہ اور نور کا مرکز ہے کہ جس کی روشنی وضیا پاشی اور خوبصورتی وزیبائی نیز برتری وکمال اور وجود وحیات اور طاقت نیز دیگر کمالات کا لامتناہی سلسلہ ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔''

''حصولی علم پر حضوری علم کی برتری کی وجہ یہ ہے کہ نفس انسانی کے امور سوائے اس کے اور کسی امور میں انجام نہیں پاتے اور نہ تو اس کو اپنے دائرے سے خارج کر سکتے ہیں اور اسے سوائے اپنے اضطراری وفوری سیر الی اللہ کے اور کوئی کام نہیں ہے (اسی لئے وہ اس چیز سے جو کہ ظاہری طور پر اس سے مخلوط ومجتمع ہے، جدا اور بے گانہ ہے سوائے

اپنے پروردگار کے! کیوں کہ وہ تو انسانوں کے ظاہر و باطن پر محیط ہے۔ بنابریں عارف وسالک انسان مشاہدہ کرتا ہے کہ اگر چہ اس کا نفس ظاہری طور پر لوگوں کے ساتھ ہے لیکن حقیقت میں وہ ہمیشہ ہی اپنے پروردگار کے ساتھ خلوت میں موجود ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں وہ ہر چیز سے منقطع و بیگانہ ہو کر صرف خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور سب کچھ بھلا کر صرف اپنے خدا کی یاد و ذکر میں سرگرم ہو جاتا ہے۔''

''ایسی حالت میں اس کے اور اس کے خدا کے درمیان کوئی پردہ ورکاوٹ حائل و مانع نہیں ہوتی اور یہی وہ حق معرفت ہے جو انسانوں کے لئے قرار دیا گیا ہے اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کو خدا کے ذریعے سے خدا کو پہچاننا قرار دیا جائے۔''[۱]

اب ایسی صورت میں حقیقت یہ ہے کہ عارف انسان کی دنیا میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے پھر وہ اس جھوٹی اور محض مادی دنیا میں زندگی نہیں گذارتا بلکہ ملکوت تک رسائی حاصل کر لیتا ہے کہ جہاں پر خدا اور اس کے اسماء و انوار کے علاوہ کسی اور کا گذر یہاں تک کہ اثر تک نہیں ہوتا لہٰذا وہ عالم ارواح اور اپنے اصلی وطن (عالم ذر) میں خدا کو دیکھتا ہے اور اپنے کئے ہوئے ازلی وعدہ کو یاد کرتا ہے اور وہاں، جہاں پر رب العالمین کے علاوہ کوئی نہیں ہے خدا کو خدا کے ذریعے پہچانتا ہے اور اس سے ہم کلام ہوتا ہے۔ یہ آگاہی جو اس کے حضور میں اور اس کے مشاہدہ کے ذریعہ آشکار ہو رہی ہے علم حضوری وشہودی کہلاتی ہے۔

رسول خداؐ سے کسی نے پوچھا کہ خدا کو آپؐ نے کیسے پہچانا؟ آپؐ نے فرمایا: تمام چیزوں کو اللہ کے ذریعے پہچانا، دعائے ابوحمزہ ثمالی میں ہم پڑھتے ہیں:

بِکَ عَرَفْتُکَ۔

اے معبود! میں نے تجھ کو تیرے ہی ذریعے سے پہچانا۔

---

[۱] المیزان، ج:۶، ص: ۲۵۳، ۲۵۴۔

دعائے عرفہ میں آیا ہے:

اَیَکُونَ لِغَیْرِکَ مِنَ الظُّھُورِ مَا لَیْسَ لَکَ حَتّیٰ یَکُونَ مُظْھِرَ لَکَ۔

کیا تیرے علاوہ کسی اور کے لئے کوئی ایسا ظہور ہے جو تیرے لئے نہ ہو کہ وہ تجھ کو ظاہر اور آشکار کرے۔

معرفت کا یہ درجہ خداوند عالم کے ان خاص اولیاء سے مخصوص ہے جو تمام امور وافعال کو خدا سے جانتے ہیں یہاں تک کہ ان کی شناخت ومعرفت بھی اسی سے جانتے ہیں اور ہر چیز کو اس کے ذریعے سے اور اس کی شناخت کے بعد پہچانتے ہیں۔ حقیقت میں اولیائے خاصِ خدا جو ایمان کے اعلیٰ منزلوں پر فائز ہیں، ان کی آنکھیں ملکوت کی جانب کھلی ہوئی ہیں اور وہ روح مطلق کے مقام میں داخل ہو چکے ہیں۔

روح مطلق ان کے وجود میں دم کردی گئی ہے۔ یہ بلند ہمت نیک بخت خاصان خدا حضرت ابراہیمؑ کی طرح زمین وآسمان کے ملکوت کا مشاہدہ کررہے ہیں اور وہاں جمال وجلال خداوندی اور نور الٰہی کا جلوہ دیکھ رہے ہیں، عالم ملکوت وہی پہلے والی دنیا ہے کہ اس موجودہ دنیا سے رخت سفر باندھ کر دوبارہ اسی پہلی والی دنیا میں پہنچیں گے اور یہ بات صددرصد طے ہے کہ وہ عالم ملکوت اور پہلی دنیا اِس دنیاوی زندگی پر احاطۂ مطلق رکھتی ہے۔

جن آیتوں میں عالم ذر اور عہد ازل کا تذکرہ ہوا ان سے بات صاف ہوگئی کہ اس دنیاوی زندگی سے پہلے ایک دوسری دنیا ہے جو بالکل اسی دنیا کی طرح ہے لیکن وہاں انسان اپنے پروردگار سے محجوب نہیں ہیں درمیان میں کوئی پردہ حائل نہیں ہے بلکہ اپنے پروردگار کی یکتائی وکبریائی کا مشاہدہ کریں گے۔

ان کا یہ مشاہدۂ پروردگار خود ان کے نفس کے مشاہدہ کے ذریعے سے انجام پذیر ہوتا ہے نہ کہ استدلال کے ذریعے بلکہ خدا سے ربط اور اس کے محتاج رہنے کی جہت کے ذریعے سے ہے کہ

ایک لحہ اس کو غائب نہیں سمجھتے ہیں (ان کی یہ ضرورت واحتیاج، خوراک و پوشاک کی ضرورت کی طرح نہیں ہے بلکہ موجودات کی اصل وجود سے وابستگی و نیاز ذاتی ہے کہ امام حسین علیہ السلام دعائے عرفہ میں فرماتے ہیں:

اِلٰهِیْ اَنَا الْفَقِیْرُ فِی غِنَایَ۔

معبود! میں اپنی غنا و دارائی میں تیرا محتاج ہوں) اسی لئے اس کے وجود کے اور ہر اس حق کے جو اس کی طرف سے ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔ گناہ کی آلودگی اور شرک کی ناپاکی اِس جہان مادّی کے احکام میں شمار ہوتی ہے نہ کہ اُس ملکوتی عالم پاک کے احکام میں۔ وہ ملکوتی جہانِ پاک فعلِ خداوندی پر قائم و دائم ہے اور خدا کے علاوہ کوئی دوسرا فعلیت وحکومت نہیں رکھتا۔

وہاں وہی عالم پاک ہے جہاں واپسی میں خدا کی جانب بازگشت کر کے ہم سب پہنچیں گے۔ وہ ایسا دن ہوگا کہ سارے اسباب ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ اس دن صرف خدائے واحد وقہار، فرمانروا اور حاکم ہوگا۔

اگر گذشتہ بیان کئے گئے مطالب کو نیکی و خیر سگالی کے ساتھ دل کی آنکھوں سے ملاحظہ کرو تو دریائے دلدادگی و دلبری کے موتی کو پالو گے۔ اس وقت شاعران عارف و عارفانِ واصل کے کلامِ کی گہرائی و گیرائی کی تہہ تک پہنچ جاؤ گے۔ دردفراق، ہندوستان سے دور بلبل ہند، نیستان سے جدا ہونے والی نَے، بحرِ فنا، شور بقا، شوق وصال، شغف دیدار و دنیائے ناصح یہ سب کے سب تمہارے دل کے اسرار نہاں کے لئے راز ورمز قرار پائیں گے۔

جیسا کہ علامہ طباطبائیؒ نے اپنی دل نشیں غزل میں فرمایا ہے:

همی گفتم و گفته ام بارها بود کیش من مهر دلدارها
پرستش به مستی است در کیش مهر برونند از این جرگه هوشیارها
به شادی و آسایش و خواب و خور ندارند کاری دل افکارها

بجز اشک چشم و بجز داغ دل بنا شد به دست گرفتارہا
کشیدند در کوی دلدادگان میان دل و کام دیوارہا
چه فرہادہا مردہ در کوہہا چه حلاجہا رفتہ بردارہا
چه دارد جہان جز دل و مہر یار بجز تودہ ہایی زپندارہا
ولی راد مردان و وارستگان نیازند ہرگز به مردارہا
مہین مہر ورزان کہ آزادہ اند بریدند از دام جان تارہا
گرہ را ز راز جہان باز کن کہ آسان کند بادہ دشوارہا
جز افسون و افسانہ نبود جہان کہ بستہ است چشم خشایارہا
بہ اندوہ آیندہ خود را مباز کہ آیندہ خوابی ست ، چون پارہا

عالمی عرفانی تناظر

{اللّٰهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ}[1]

''کلمۂ نور کا ایک مشہور و معروف مفہوم ہے اور وہ ایسی چیز ہے جو تاریک اجسام کو ہمیں دیکھنے میں روشن و واضح کرتا ہے اور اس کے ذریعہ ہر چیز واضح و آشکار ہو جاتی ہے۔ لیکن نور ذاتی طور پر واضح و آشکار ہوتا ہے، بنابریں نور خود دوسرے کو ظاہر اور آشکار کرنے والا ہوتا ہے۔ یہ نور کا پہلا مطلب و مفہوم ہے بعد میں استعارہ یا ثانوی حقیقت کے طور پر مجموعی طور پر استعمال میں لایا گیا ہے جو ہر چیز میں محسوسات کو وجود میں لائے، اسی کے نتیجہ میں ہمارے ظاہری حواس کو ظاہری نور یا نور کا مالک بتایا گیا ہے کیوں کہ اسی نور کے وسیلے سے محسوسات ہم پر ظاہر ہوتے ہیں اور ہم ان کا ادراک کر پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر بینائی و شنوائی کی حس وغیرہ کی بات کی جاسکتی ہے... پھر اس کے مفہوم کو وسیع تر کرتے ہوئے غیر محسوس کو بھی شامل کر دیا، جس کے نتیجہ میں عقل کو نور کا نام

---

[1] سورۂ نور، آیت: ۳۵۔

دے دیا کیوں کہ اس کے ذریعہ معقولات کو ظاہر کیا جا سکتا ہے اور ان تمام معنیٰ کا استعمال نور کے اصلی معنیٰ کو وسعت دینے کی خاطر ہے۔''

''چوں کہ سبھی چیزوں کا وجود وہستی، دوسروں کے لئے اس کے ظہور کا باعث ہے، اس لئے مکمل مصداق نور ہوگا اور چوں کہ ممکن موجودات کا وجود خدائے متعال کے کرنے سے ایجاد ہوا ہے لہٰذا خداوند متعال نور کا مکمل مصداق ہے اور وہی وہ ہے جو اپنے لئے آشکار اور اپنے علاوہ دوسروں کو آشکار کرنے والا ہے اور ہر موجود کا ظہور اس کی وجہ سے ہے اور ہر چیز اس کے وجود سے معرض وجود میں آتی ہے''۔[1]

''بنابریں خداوند عالم ایسا نور ہے کہ جس کے ذریعہ اور جس کی وجہ سے آسمانوں اور زمین کا وجود عمل میں آیا ہے... اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ خداوند عالم کسی بھی موجود کے لئے مجہول نہیں ہے کیوں کہ تمام چیزوں کا ظہور اپنے لئے یا اپنے غیر کے لئے، خدا کے ظاہر کرنے کی وجہ سے ہے، اگر خداوند عالم کسی چیز کو وجود نہیں بخشتا تو وہ وجود میں نہ آتی اور اس کو ہستی و وجود کا افتخار حاصل نہ ہوتا بنابریں ہر چیز سے پہلے خدا آشکار ہے، جیسا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی دعائے عرفہ میں فرماتے ہیں:

''اَنْتَ الَّذِیْ تَعَرَّفْتَ اِلَیَّ فِی کُلِّ شَیْءٍ فَرَأَیْتُکَ ظَاهِراً فِیْ کُلِّ شَیْءٍ وَاَنْتَ ظَاهِرٌ لِکُلِّ شَیْءٍ''

خداوندا! تو ہی وہ ہے کہ جس نے سبھی مخلوقات میں تجلی کی ہے اور خود کو ساری چیزوں میں مجھے دکھایا ہے لہٰذا میں نے تجھے ہر چیز میں آشکارا طور پر دیکھا ہے اور تو ساری چیزوں میں آشکار اور ظاہر ہے۔''

''اور مندرجہ ذیل آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ فرمایا:

---

[1] المیزان، ج:۱۵، ص:۱۶۹۔

{أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللهَ يُسَبِّحُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرُ صَافَّاتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ}[1]

کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور پروں کو پھیلائے ہوئے پرندے، غرض یہ کہ سبھی خدا کی تسبیح میں سرگرم ہیں اور سبھی اپنی نماز اور ذکر خدا کے طریقہ کو جانتے ہیں۔اس آیت سے تمام مخلوقات عالم کی تسبیح خوانی کی بات ثابت ہوتی ہے اور اس کا لازمہ یہ ہے کہ سبھی مخلوقات کو خدا کو پہچاننا چاہیئے۔

کیوں کہ تسبیح وستائش اسی کی صحیح مانی جاسکتی ہے جس کو معلوم ہو کہ کس کی ستائش و پرستش کررہا ہے اور کس کے لئے عبادت میں سرگرم ہے، بنابریں، یہ آیت اس آیت جیسی ہے جس میں فرمایا ہے:

{وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ}[2]

کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی تسبیح وستائش میں سرگرم نہ ہو لیکن تم لوگ ان کی تسبیح و ستائش کو نہیں سمجھتے ہو۔

"بنابریں یہاں تک یہ بات تو سمجھ میں آگئی کہ جملہ میں نور سے مراد، آسمانوں اور زمین میں خدا کا نور ہے کہ جس سے عالم کا نور سرچشمہ حاصل کرتا ہے، یہ ایسا نور ہے کہ جس سے ہر چیز روشن ہوتی ہے اور یہ وہی وجود ہے کہ جسے دوسرے لفظوں میں خدا کی ہمہ گیر شمول رحمت کہا جاسکتا ہے۔"[3]

جن لوگوں نے ایمان واخلاص اور عمل صالح کے ساتھ معرفت حاصل کرنے کی کوشش

---

[1] سورۂ نور، آیت: ۴۱۔

[2] سورۂ اسرا، آیت: ۴۴۔

[3] المیزان، ج: ۱۵، ص: ۱۶۹ تا ۱۷۰۔

کی ہے اور خود کو پہچانتے ہوئے روح کی تائید کے مرحلہ تک پہنچے ہیں وہ لوگ نور خدا کو ہر جگہ دیکھتے ہیں اور انہوں نے وہم وگمان کے پردوں اور حجابات کو ہٹا کر صرف خدا سے لولگا رکھا ہے کہ جس کے نتیجہ میں "یہ محبت ایک ایسے نور میں تبدیل ہو جاتی ہے جو اس کے لئے راہ عمل کو روشن کرنے والی شمع بن جاتی ہے... اور ایک ایسی روح میں یہ نور تبدیل ہو جاتا ہے جو اس کو نیکی وخیر کی طرف راغب کرتا ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا:

{وَ أَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ}[1]

"اس طرح کا آدمی دنیا کی کسی بھی مخلوق اور وجود میں آنے والے حوادث پر توجہ نہیں دیتا ہے مگر یہ کہ اس کو پسند کرتا ہو اور اسے خوبصورت سمجھتا ہو کیوں کہ وہ سوائے اس پہلو کے اس میں کچھ اور نہیں دیکھتا ہے کہ خدا کی آیات ونشانیاں اور اس کے مطلق جمال اور لامتناہی حسن کی تجلیاں جلوہ گر ہیں اور وہ کمی ونقائص سے دور اور مبرّا ہے اسی لئے اس طرح کے لوگ خدا کی نعمتوں میں غرق رہتے ہیں اور انہیں ایسی خوشی نصیب ہے کہ جس میں غموں کا شائبہ اور وجود نہیں ہوتا، وہ ایسی لذت ونشاط کے مالک ہوتے ہیں جو غم واندوہ سے دور ہے اور انہیں ایسا سکون حاصل ہوتا ہے کہ جس میں کوئی خوف و ہراس اور پریشانی کا گذر نہیں ہے۔"

"ایسا شخص کسی چیز کو ناپسند وناخوش نہیں دیکھتا، سوائے خیر وخوبی اور حسن وزیبائی کے اور کچھ مشاہدہ نہیں کرتا ہے اور وقائع کو سوائے دل کی مراد کے موافق اور اپنی مرضی کے مطابق نہیں پاتا ہے۔"

مندرجہ ذیل آیت بھی اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے:

---

[1] سورۂ مجادلہ، آیت: ۲۲۔

{اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ}[1]

آگاہ رہو کہ اولیائے خدا کے دلوں میں نہ تو خوف و ہراس ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے دلوں میں غم واندوہ کی رسائی ہوتی ہے۔

''...اس گروہ والے وہی مقربین ہیں جو خدائے تعالیٰ کے قرب کی وجہ سے کامیاب ہوئے ہیں اور ان کے اور ان کے پروردگار کے درمیان ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو حائل ہو اور رکاوٹ وجود میں لاتی ہو، نہ تو محسوسات وموہومات کا عمل دخل ہوتا ہے اور نہ ہی نفسانی خواہشات اور شیطان کی شیطنت اور دھوکے بازی کا گذر بسر ہوتا ہے۔''[2]

فردا ز روی خجلت چون بنگرم به رویش   رویی به غیر رویش امروز اگر ببینم

ایک لحاظ سے اولیائے خدا، خدا کو آسمانوں اور زمین کا نور سمجھتے ہیں اور آسمانوں اور زمین میں خدا کے نور کا مشاہدہ کرتے ہیں اور زمین نیز آسمانوں کو نور خدا اس میں غوطہ زن پاتے ہیں۔ البتہ اس بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ یہ پراکندہ ومنتشر حقائق آفاقی آیات اور نشانیوں کی دنیا میں نہیں ہیں بلکہ یہ نور، ولی خدا کی روح ہے جو آیات الٰہی کے آئینہ میں ظہور پذیر ہوئی ہے اور دراین اثناء اولیائے حق سوائے نور کے اور کچھ نہیں دیکھتے ہیں کیوں کہ اس کا نور جمال وجلال الٰہی کی تابانی نور کا حصہ ہے۔

{وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ}[3]

''یہ دنیا صرف اور صرف خداوند عالم کی نیاز مند، محتاج اور حاجت مند ہے اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے، انسان مکمل طور سے اپنے پورے وجود، ذات وصفات اور سبھی

---

[1] سورۂ یونس، آیت: ۶۲۔

[2] المیزان، ج:۱۱، ص:۲۱۸۔

[3] سورۂ اسرا، آیت: ۴۴۔

حالات وکوائف میں خدا کا محتاج و نیاز مند ہے۔ اسی طرح ضرورت ان لوگوں کے وجود کے لئے بہترین کاشف ہے جو کہ اس کے ضرورتمند ومحتاج ہوا کرتے ہیں اور یہ ضرورت اس بات کو سمجھاتی ہے کہ اس کے وجود کے بغیر محتاج کی بھی کوئی وقعت نہیں ہے اور وہ کوئی بھی لحہ اس سے الگ اور بے نیاز نہیں ہے۔''

''دنیا کی سبھی مخلوق وموجود کے اندر پائی جانے والی حاجت وضرورت، اپنے وجود میں معائب ونقائص کے ہوتے ہوئے، اس قوی وغنی کی موجودگی کی خبر دیتی ہیں جو کہ ان کے وجود کو معرض وجود میں لانے والا ہے اور بدرجۂ اتم واکمل اس کی حکمرانی ہے۔''

''اسی طرح ساری مخلوق اور موجود چیزیں دیگر مخلوقات وموجودات عالم سے اپنے وجود کی تکمیل کے لئے مدد حاصل کرتی ہیں اور اس طرح اپنے نقائص اور کمیوں کو پورا کرتی ہیں وہ واضح طور سے ہر چیز کو وجود میں لانے والے اور پروان چڑھانے والے نیز نظارت وسرپرستی کرنے والے کے وجود کی خبر دیتی ہیں۔''

''...... خداوند عالم کے کلام سے اس طرح سے سمجھا جا سکتا ہے کہ سبھی موجودات کے اندر علم کا مسئلہ پایا جاتا ہے اور وہ موجود بھی ہے اور جہاں کہیں بھی تخلیق پائی جاتی ہے وہاں علم کا نفوذ پایا جاتا ہے، اسی طرح ہر موجود جتنا وجود (یا روح مطلق) سے فائدہ اٹھاتا ہے اسی قدر علم سے استفادہ کرتا ہے، البتہ اس بات کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ سبھی موجودات عالم، علم کے لحاظ سے برابر ہیں، یا یہ کہیں کہ سب کے اندر ایک طرح اور ایک نوعیت کا علم پایا جاتا ہے، یا جو کچھ انسان سمجھتا ہے، سارے موجودات وہی سمجھتے ہیں.... ان آیات کے پیش نظر:

{قَالُوا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْ اَنْطَقَ کُلَّ شَیْءٍ}[1]

قیامت کے دن اعضائے بدن بولیں گے:

---

[1] سورہ فصلت، آیت: ۲۱۔

وہ خدا کہ جس نے سبھی مخلوقات عالم کو قوت گویائی عطا کی اس نے ہمیں بھی نعمت کلام سے نوازا ہے۔

{فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ}[1]

بنابریں خداوند عالم نے آسمان و زمین سے فرمایا: اپنے دل سے یا بصورت اکراہ و جبر میری طرف آؤ۔ انہوں نے کہا: بڑے اشتیاق اور عاشقانہ طور پر آئیں گے۔[2]

"اس کے بعد فرمایا:

{تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ}[3]

آسمان کے ساتوں طبق اور زمین نیز ہر چیز اور ہر جاندار جو اس میں ہے، خدا کی تسبیح خوانی کرتے ہیں اور (شعور پر مبنی ان آیات سے) ہر موجود کے لئے تسبیح حقیقی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔"[4]

قرآن کریم کی ان آیتوں میں کچھ ایسے موارد پائے جاتے ہیں کہ جن کے پیش نظر مخلوقات و موجودات کی تسبیح کے حقیقی ہونے کے بارے میں انکار نہیں کیا جاسکتا ہے اس طرح کی آیات کی سنخ میں سے یہ آیہ شریفہ ﴿إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ﴾[5]

اسی طرح ہم نے پہاڑوں کو مسخر کیا جو داوٴد کے ساتھ دن رات، تسبیح کیا کرتے تھے اور اسی طرح یہ آیہ کریمہ ہے:

---

[1] سورہٴ فصلت، آیت: ۱۱۔

[2] المیزان، ج: ۱۳، ص: ۱۵۰، ۱۵۱۔

[3] سورہٴ اسراء، آیت: ۴۴۔

[4] المیزان، ج: ۱۳، ص: ۱۵۲۔

[5] سورہٴ ص، آیت: ۱۸۔

{وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ}[1]

اور پہاڑوں کو پرندوں کے ساتھ مامور و مقرر کیا تا کہ داؤد کے ساتھ تسبیح پروردگار کریں۔ ان دونوں آیتوں میں ایک ہی سیاق و سباق کو بیان کیا گیا ہے اور یہ حکم ہوا ہے کہ پرندوں اور پہاڑوں کو تسبیح خدا کرنے کے لئے کہا گیا ہے اور اسی مضمون کے تحت یہ آیت بھی ہے:

{يَا جِبَالُ أَوِّبِي مَعَهُ وَالطَّيْرَ}[2]

اے پہاڑو اور پرندو! داؤد کے ساتھ ہم آواز ہو جاؤ۔

''ان آیات کے پیش نظر اب یہ مفہوم نہیں رکھتا کہ پہاڑوں اور پرندوں کے سلسلہ میں تسبیح کو زبان حال اور داؤد کو زبان قال کی نسبت دیں''۔[3]

قرآنی آیات پر غور کرنے کے بعد انسانوں کے لئے کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ قرآن کریم نے موجودات کو اس کے درمیان پائے جانے والے تمام اختلاف و فرق کے باوجود خدا کی نشانی قرار دیا ہے کہ جس میں اس کے اسماء و صفات مجسم ہیں اور کوئی بھی ایسی مخلوق موجود نہیں ہے جو اپنے وجود کی اصلیت کے اعتبار سے اور اپنے وجود میں فرض کی جانے والی ہر جہت سے خدا کی عظمت اور بزرگی کی طرف اشارہ نہیں کرتی ہے۔

''آیت اس لحاظ سے کہ آیت (نشانی) ہے، اس کا وجود ہی آئینہ ہے کہ وہ صاحب آیت میں فانی ہے اور اس کے بغیر اس کو استقلال حاصل نہیں ہے اور اس نے اپنی ہستی و صفات کے ذریعہ خدا کے ہستی کی حکایت کی ہے اور اس کے صفات کی نشاندہی بھی۔''[4]

---

[1] سورۂ انبیاء، آیت: ۷۹۔

[2] سورۂ سباء، آیت: ۱۰۔

[3] المیزان، ج: ۱۳، ص: ۱۵۴۔

[4] المیزان، ج: ۱۳، ص: ۲۶۹۔۲۷۰۔

اسی وجہ سے سارا عالم اسماء وآیات خداوندی ہے کیوں کہ سب اسی کا نام پیدا کرتے ہیں اور سب اسی کو ظاہر کرتے ہیں۔

گوہر نایاب و بے مثال وجودِ توحید

''عام طور سے لوگ اپنے پروردگا کے مقام و مرتبہ سے لاعلم ہوتے ہیں اور اس بات سے بھی غافل رہتے ہیں کہ خداوند عالم ان پر احاطہ وتسلط رکھتا ہے۔ اسی لئے باوجود اس کے کہ فطرت انسانی خدا کے وجود اور اس کی وحدانیت کی طرف مہمیز وہدایت کرتی ہے پھر بھی عالم مادہ کے بھنور اور قانون فطرت کی انسیت اور رواج وسماج کی الجھنوں اور پریشانیوں کا شکار ہونے نیز کثرت وتفرقہ اور علیٰحدگی کی سرگرمیوں میں مبتلا ہونے کے سبب (جو کہ فطرت کا لازمہ ہے) لوگ مجبور ہوجاتے ہیں کہ ربوبی وملکوتی دنیا کا موازنہ مادی ومانوس دنیا سے اور خداوند عالم کو توانا وقدرتمند بادشاہ کی طرح تصور کریں۔''

''......اگر انبیاء سے یہ سننے میں آتا ہے کہ خداوند عالم ارادہ وکراہت اور عطاومنع کا مالک ہے اور نظام خلقت کی تدبیر کرتا ہے تو ذہن انسانی فوراً ایسے شخص کی بادشاہت کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے کہ جسے ہم بادشاہ مانتے ہیں، اس طرح کہ نعوذ باللہ وہ بھی کوئی محدود موجود ومخلوق ہے اور اس کا وجود اطراف واکناف عالم میں پراکندہ ہے اور ملائکہ و دیگر مخلوقات کا اپنا الگ اور مستقل وجود ہے جو کہ سبھی اپنے وجود اور ان نعمتوں کے مالک ہیں کہ جنہیں خداوند عالم نے انہیں عطا کیا ہے۔''

''... جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہماری زندگی اور وجود یا ہمارا علم اور طاقت خدا کی دی ہوئی چیزیں ہیں تو عوام کی نظروں میں ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جاتا ہے کہ جو کچھ ابھی رعایا کے پاس ہے پہلے وہ سب کچھ بادشاہ کے پاس تھا اور اس نے رعایا کو دیا ہے۔

''اس طرح کے سبھی وہ احکام جو عام انسان خدا اور خلق خدا کے سلسلہ میں رکھتے ہیں اس

کی بنیاد، خدا کو محدود کرنے اور مخلوق سے اس کی دوری وعلیٰحدگی پر مبنی ہے لیکن عقلی برہان ان سبھی اوہام کے فاسد و باطل ہونے کا حکم کرتے ہیں۔''[1]

''توحید کا مسئلہ سبھی علمی مسائل سے زیادہ علمی و دقیق تر ہے اور اس کا تصور و ادراک سب سے زیادہ مشکل اور اس کی گرہیں دوسرے مسائل سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں کیوں کہ یہ مسئلہ ایسے زمرے میں آتا ہے کہ جس کا افق دیگر علمی مسائل نیز اس کے افکار کا افق عوامی سطح کے لحاظ سے کہیں زیادہ بلند اور اونچا ہے اور یہ نوعیت وسنخیت کے اعتبار سے ان مشہور قضایا میں سے نہیں ہے کہ جس سے عمومی افکار مانوس ہیں اور دلوں میں راسخ ہو چکے ہیں۔''[2]

لیکن وہ لوگ کہ جنہوں نے معرفت نفس کے اعلیٰ مدارج طے کر لئے ہیں اور ایمان کے اعلیٰ مدارج سے خود کو تابناک بنالیا ہے اور روح مطلق تک رسائی پالی ہے، انہوں نے بہتر طریقہ سے توحید کے اسرار کو حاصل کرلیا ہے اور سبھی طرح کے واہموں اور خیالوں کو اپنے دل و دماغ اور فکر وشعور سے نکال پھینکا ہے۔

مردان خدا پردهٔ پندار دریدند — یعنی همه جا غیر رخ یار ندیدند

فریاد که در رهگذر عالم خاکی — بی دانه فشاندند و بی دام تنیدند

غفلت وعرفان

کتاب تحف العقول میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث روایت ہوئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

جو شخص یہ خیال کرے کہ وہ خدا کو پہچانتا ہے لیکن اس کی خداشناسی دلی توہمات کی بنیاد

---

[1] المیزان، ج:۱۰، ص:۳۱۴، ۳۱۵۔

[2] المیزان، ج:۶، ص:۱۲۶۔

پر ہوتو در حقیقت نہ صرف یہ کہ اس نے خدا ہی کو نہیں پہچانا ہے بلکہ شرک کا ارتکاب بھی کر بیٹھا ہے کیوں کہ اس نے اپنے ذہن میں جو تصویر مجسم کی ہے اس کی اس نے پرستش کی ہے اور جو کوئی یہ سوچے کہ خدا کو پہچان لیا ہے تاہم اس کی خدا شناسی اسماء کے ذریعہ بغیر معنیٰ کے ہو تو در حقیقت اس نے خدا پر طعنہ کسا اور نقص وحدوث کو خدا سے نسبت دی کیوں کہ اسماء حادث ہیں اور پیدا کرنے والے کے محتاج ہیں۔

''جس نے یہ سوچا کہ اس نے خدا کو پہچان لیا ہے لیکن اس کی معرفت اسم و معنیٰ دونوں طرف سے ہو اور وہ دونوں کی پرستش کرے تو ایسے آدمی نے کسی دوسرے کو خدا کا شریک بنایا ہے اور اگر کوئی یہ گمان کرے کہ اس نے خدا کو پہچان لیا ہے جب کہ اس کی معرفت و خدا شناسی غائبانہ توصیفات کے ذریعہ ہو نہ کہ ادراک کے حصول کے ذریعہ تو اس نے غائب خدا کا اثبات کیا ہے اور مختصر یہ کہ جس خدا کو صفت کے ذریعہ اور پھر اس کو موصوف پہچانا ہے، ایسی حالت میں اس نے کسی بڑے کو چھوٹا کر دیا ہے اور (حقیقت یہ ہے کہ) ''وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ'' چند و چنداں اور چوں چرا کے ذریعہ خدا کو نہیں پہچانا جا سکتا ہے۔

''جب حضرتؑ کی بات یہاں تک پہنچی تو ایک آدمی نے عرض کیا:

اس بیان کی بنیاد پر توحید خداوندی تک کیسے رسائی حاصل کی جا سکتی ہے؟

امام عالی مقامؑ نے فرمایا:

پانے کی راہ بڑی ہی کشادہ اور کھلی ہوئی ہے، جب انسان اپنے آس پاس حاضر چیز کو دیکھتا اور پاتا ہے تو سب سے پہلے اس کے بارے میں معرفت حاصل کرتا ہے اور اس کو دیگر چیزوں سے الگ پاتا ہے، پھر اس کے اوصاف کا پتہ لگاتا ہے اس غائب کے برخلاف کہ جس قدر اس کے اوصاف سے آگاہی حاصل کرتا ہے وہ اوصاف اپنی کلیت و عمومی کے لحاظ سے پردۂ ابہام میں باقی رہتے ہیں اور وہ جب واضح و آشکار

ہو جاتے ہیں تب ہی سمجھ پاتا ہے اور ان کا ادراک کر پاتا ہے۔

''یہ کہا گیا ہے کہ حاضر اپنی صفات سے پہلے ہی کیسے پہچانا جا سکتا ہے؟ فرمایا: تم سب سے پہلے تو یہ کہ حاضر کو پہچانو گے اس کے بعد اس کے علم کو یا اس صفت سے متعلق علم کا پتہ لگاؤ گے یا اس سے واقفیت کے بعد اس کا علم حاصل کرو گے اور اس کا علم حاصل کرنے کے بعد خود اپنے آپ کو کہ جس کے معلول ہو پہچانو گے۔ البتہ تم اپنے ذریعہ سے خود کو پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہو اور یہ بات جانتے ہو اور یہ یقین حاصل کر لو گے کہ جو کچھ تمہارے نفس میں ہے خداوند عالم کے دم سے قائم ہے اور وہ اس سے واقف و آگاہ ہے اور دوسرے لفظوں میں تمہاری ہستی اور تمہاری شناخت سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔''

''یہ معنیٰ اس معرفت کے مانند ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو ان کی بہ نسبت حاصل تھی کیوں کہ جب برادران یوسف نے اپنے بھائی سے کہا: کیا تم حقیقت میں وہی یوسف ہو؟ تو انہوں نے کہا: ہاں میں ہی یوسف ہوں اور بنیامین میرے مادری و پدری بھائی ہیں۔ اس واقعہ میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے انہیں ان کے ذریعہ پہچانا نہ کہ ان کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے۔''[1]

یہ حدیث واضح طور سے عرفان کی ماہیت و حقیقت کو بیان کرتی ہے اور وہ یہ کہ ہم نے ازل سے خدا کو دیکھا ہے اور پورے وجود کے ساتھ اس کی ربوبیت کی گواہی دی ہے۔ عرفان یعنی اس حقیقت کی جانب بازگشت اور اصلی و حقیقی معرفت کا احیاء کرنا ہے ''عرفان و معرفت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی قوت ادراک میں جو کچھ وجود میں آتا ہے اور جو کچھ اس نے نہاں خانوں میں چھپا رکھا ہے اس سے مطابقت کرے

---

[1] المیزان، ج:۶، ص:۲۵۷، از تحف العقول، ص:۳۴۱۔

اور یہ تمیز و تشخیص دے سکے کہ یہ وہی ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ سابقہ علم کے بعد ہونے والے ادراک کو معرفت کہتے ہیں۔''[1]

علامہ طباطبائیؒ اس آخری حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''انسان جب اپنے نفس کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کے سلسلہ میں غور وفکر کرتا ہے اور غیروں کو دل سے خالی کرتا ہے اور اس کے ساتھ خلوت کرتا ہے تو پھر ہر چیز سے رشتہ توڑ کر خداوند عالم سے جوڑ لیتا ہے جس کی وجہ سے اس کے دل میں خدا کی ایسی معرفت پیدا ہوتی ہے کہ جس کے حصول میں کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور ایک ایسا علم حاصل ہوتا ہے جس تک رسائی کے لئے کسی کی معمولی مداخلت بھی نہیں ہوتی اس لئے کہ جب انسان خدا کے غیر سے رشتہ توڑ لیتا ہے تو اس کا یہ انقطاع تمام حجابوں اور رکاوٹوں کے برطرف ہونے کا باعث ہوتا ہے۔

''یہ وہ مقام ہے جہاں انسان اپنے پروردگار کی کبریائی اور عظمت وجلالت کو مشاہدہ کرکے اپنے کو بھلا دیتا ہے... اپنے نفس میں محسوس کرتا اور یقین کرلیتا ہے کہ انسان سراسر خدا کا فقیر، محتاج اور اس کا ایک ایسا غلام ہے جس کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے''۔[2]

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اپنے ایک خطبہ میں خدا سے مناجات کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''خدایا! تو ہر قسم کے عیب ونقص سے مبرّا ومنزّہ اور پاک وپاکیزہ ہے اور تو نے پوری کائنات کے چپہ چپہ کو اپنے وجود اور آثار خلقت سے بھر دیا ہے، تو ہر شئے سے جدا ہے لیکن کوئی بھی چیز تجھ سے جدا اور دور نہیں ہے... خدایا! کس آنکھ میں اتنی طاقت ہے جو تیرے نور کا مشاہدہ کرسکے؟ اور کون سی ایسی آنکھ ہے جو تیری قدرت کی تابندگی کے

---

[1] المیزان، ج:۲،ص:۲۷۳۔

[2] ایضاً، ج۶،ص۲۵۸۔

اوج وانتہا کو دیکھ سکے؟ فہم وشعور ان چیزوں کا ادراک کر سکتے ہیں جنہیں تو نے وہاں خلق کیا ہے، ہاں! صرف وہی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں جن کے حجابوں کو تو نے برطرف کر دیا ہے اور تاریکیوں کے پردوں کو تو نے ہٹا دیا ہے، پس ان کی روحیں عظیم المرتبت روحوں کی مدد سے پرواز کر گئیں اور مقام قدس میں تجھ سے راز و نیاز میں مشغول ہو گئیں اور تیرے نور کے سمندر میں غوطہ ور ہو گئیں اور زمین کی بلندیوں سے پستیوں کا نظارہ کیا اور تیری کبریائی کو مشاہدہ کیا، ملکوتیوں نے انہیں زائر اور جبروتیوں نے انہیں آباد کرنے والوں کے خطاب سے نوازا''۔[1]

''مذکورہ روایتوں اور حدیثوں سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ فکر ونظر اور فکری علوم کے ذریعہ حقیقی معرفت حاصل نہیں کی جاسکتی اس لئے کہ مذکورہ روایتیں جن الٰہی مواہب وعطایا کی طرف اشارہ کر رہی ہیں وہ اولیائے الٰہی سے مخصوص ہیں، اور ہرگز کوئی بھی فکر اس سیر وسلوک کے مرحلہ تک نہیں پہنچ سکتی''۔[2]

شیخ سعدی، اپنی کتاب بوستان میں کیا خوب فرماتے ہیں:

رہِ عقل جز پیچ در پیچ نیست — بر عارفان جز خدا ہیچ نیست

توان گفتن این با حقایق شناس — ولی خردہ گیرند اہل قیاس

کہ پس آسمان و زمین چیستند — بنی آدم و دیو و ددکیستند

پسندیدہ پرسیدی ای ہوشمند — جوابت بگویم گر آید پسند

کہ خورشید و دریا و کوہ و فلک — پری، آدمی زاد و دیو و ملک

ہمہ ہر چہ ہستند از آن کمترند — کہ با ہستی اش نام ہستی برند

---

[1] ایضاً ج ۶، ص ۲۵۸، ۲۵۹، از اثبات الوصیلہ، ص ۱۰۵۔

[2] ایضاً، ج ۶، ص ۲۵۸۔

حقیقت قلب

خدا کی حقیقی معرفت انسان کو قلب سے حاصل ہوتی ہے لیکن ایک ایسے قلب سے جو ہر قسم کی بیماری اور عیب ونقص سے پاک و پاکیزہ ہو، جب ایسا دل ہو تو اسے خدا کی حقیقی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ ''قلب سے مراد خود انسان یعنی اس کی روح ہے''[1]

اور حقیقت میں وہ روح یا قلب جو ہر قسم کے عیب ونقص سے پاک ہو اور روح مطلق سے متصل ہوگئی ہو ایسا قلب، قلب سلیم کہا جاتا ہے۔

''قلب کی صحت وسلامتی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس مقام پر فائز ہو کہ وہ اپنی فطرت کے راستے پر گامزن ہو اور راہ اعتدال سے دور نہ ہو اور اس کی اصل، خدا کی وحدانیت میں خلوص توکل اور غیر خدا سے رشتہ توڑنے میں پوشیدہ ہے''۔[2]

روح کو اس لئے قلب کہا جاتا ہے کہ یہ جہاں ایک طرف معمولی روح بلکہ روح حیوانی سے بھی حقیر درجہ تک سقوط کرسکتی ہے وہیں دوسری طرف روح مطلق کے درجہ تک سیر بھی سکتی ہے جیسا کہ مناجات شعبانیہ میں وارد ہوا ہے: ''وَتَصِیْرَ اَرْوَاحُنَا مُعَلَّقَةً بِعِزِّ قُدْسِکَ'' اور ہماری روح کو اس طرح منقلب کردے کہ وہ تیرے قدس کے عز وشرف سے وابستہ ہوجائے۔

خداوند متعال کی وحدت غیر عددی

''قرآن اپنی نورانی وعالی تعلیمات میں خداوند عالم کی وحدت عددی کی نفی کرتا ہے اس لئے کہ اگر خدا کے سلسلہ میں وحدت عددی کو مان لیا جائے تو اس کا لازمہ اس کا محدود ہونا ثابت ہوگا لہٰذا وہ واحد جس کی وحدت عددی ہو وہ لامحالہ زمانی ومکانی اور دیگر ہزاروں حدود کا پابند نظر آئے گا اور ہم اسے درک کرنے کے لئے ناچار ہوں گے کہ

---

[1] ج:۲ص:۳۳۵۔

[2] ج:۵،ص:۶۲۰۔

اپنے فہم وشعور کے قید و بند میں جگہ دیں"۔

"اسی لئے قرآن کریم نے خداوند عالم کو ہر اس چیز سے منزہ اور پاک و پاکیزہ قرار دیا ہے جس سے وہ محدود اور کسی کا مقدور نظر آئے یا کوئی اسے اپنے احاطے میں لینا چاہے یا اس کی قدرت کا ماتحت نظر آئے، قارئین حضرات کے لئے مذکورہ نکتہ کو اس مثال کے ذریعہ آسان بنایا جاسکتا ہے کہ اگر آپ اپنے گھر کے حوض میں موجودہ پانی کو جو پورا کا پورا ایک پانی کہا جاتا ہے دوسو ظروف میں تقسیم کر دیں تو آخر میں آپ مشاہدہ کریں گے کہ جو پانی ابھی تک ایک تھا اب وہ تقسیم ہونے کے بعد دوسو صورتوں میں بدل چکا ہے اور اس کی وحدت کثرت میں بدل چکی ہے۔

اب اگر کوئی آپ سے یہ سوال کر بیٹھے کہ ان ظروف میں موجودہ پانی کی وحدت کہاں سے آئی ہے؟ اور کیوں کر جو پانی ابھی تک تماماً ایک واحد تھا اب وہ دوسو حصوں میں منقسم ہوگیا ہے؟ تو آپ اس کے جواب میں فرمائیں گے: اس کثرت کی وجہ یہ ہے کہ جو پانی جس ظرف میں ہے وہ دیگر ظروف کے پانی سے بالکل الگ ہے اور جو پانی ایک سوننانوے ظروف میں ہے وہ اس ایک ظرف سے الگ ہے لہذا ہر پانی کی حد اس کا اپنا ظرف ہے۔

"اسی طرح ایک انسان اس وجہ سے ایک ہے کہ اس میں تمام انسانوں کے امتیازات و خصوصیات اکٹھا نہیں ہیں، اس میں جملہ انسانوں کے خصوصیات کا نہ ہونا اس کی حد ہے کہ اگر یہ حد نہ ہوتی تو وحدت و کثرت کا مسئلہ پیش ہی نہ آتا۔

اس مثال کے ذریعہ یہ نکتہ بخوبی واضح و روشن ہوگیا کہ ہزاروں امر عدمی کے مقابلے میں ایک وجود کا محدود ہونا باعث ہوا ہے کہ واحد عددی، واحد کی شکل میں نظر آئے اور ایسے ہی ہزاروں واحد کے عدد سے کثرت عددی وجود میں آئے۔

پس قرآن کی اعلیٰ ہدایات اور نورانی تعلیمات کی روشنی میں خداوند عالم کی ذات اقدس مقہوریت سے منزہ ہے بلکہ وہ ایک ایسا قاہر ہے جو ہرگز مقہور واقع نہیں ہوتا، اسی لئے اس کے

سلسلہ میں کثرت عددی کا تصور ناممکن ہے، اسی نکتہ کے پیش نظر خداوند عالم فرماتا ہے:

"هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ"۔[1]

"قرآن کریم کی اعلیٰ اور بے مثال تعلیم میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے ہر کمال کے درجۂ اتم کو خدا کی ذات سے مخصوص جانا ہے اور اس کی ذات اقدس کو ہر قسم کے عیب و نقص سے مبرّ ا ومنزہ قرار دیا ہے، یہ ایک ایسی حقیقت اور سربستہ راز ہے جس تک رسائی ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے، قرآن کریم کی تعلیمات کی روشنی میں خدا کی وحدانیت کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ سب سے پہلے دو چیزیں فرض کی جائیں؛ ان میں سے ایک ہر اعتبار سے محدود اور متناہی ہو اور دوسری ہر قسم کی محدودیت سے مبرا اور لامتناہی ہو، اس فرض کے بعد اگر تھوڑا غور کیا جائے تو یہ نکتہ کھل کر سامنے آئے گا کہ جو چیز نامحدود ہے وہ پوری طرح سے محدود چیز پر محیط اور اس پر چھائی ہوئی ہے یعنی جو چیز متناہی ہے وہ کسی بھی حال میں کمال کے اعتبار سے نامحدود کو اپنے احاطے میں نہیں لے سکتی اور ہرگز اس کی برابری نہیں کرسکتی بلکہ جو چیز لامتناہی اور لامحدود ہے وہ ہر حال میں متناہی اور محدود پر بھاری اور اس پر غالب ہے، اس میں مغلوب کا ہر کمال اور صفت کا پایا جانا ایک لازمی امر ہے، جو چیز لامحدود ہے وہ بذات خود شاہد و مشہود اور اپنی ذات پر محیط ہے اس پر کوئی محیط واقع نہیں ہوسکتا، اس وضاحت کے بعد اس آیت کا مطلب بالکل واضح ہوجاتا ہے:

"اَوَلَمْ یَکْفِ بِرَبِّکَ اَنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ اَلَا اِنَّهُمْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِّقَاءِ رَبِّهِمْ اَلَا اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ"۔[2]

اور کیا پروردگار کے لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ ہر شئے کا گواہ اور سب کا دیکھنے والا ہے۔ آگاہ ہوجاؤ کہ یہ لوگ اللہ سے ملاقات کی طرف سے شک میں مبتلا ہیں اور آگاہ

---

[1] سورہ رعد، آیت نمبر ۱۶۔

[2] سورۂ فصلت، آیت: ۵۳، ۵۴۔

ہو جاؤ کہ اللہ ہر شئے پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

مذکورہ دو آیتیں ہی نہیں ہیں بلکہ قرآن کریم میں اور بھی بہت سی آیتیں ایسی ہیں جو خدا کے اوصاف کو بیان کرتی ہیں اور واضح طور پر دلالت کرتی ہیں یا ان آیتوں کا ظہور اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس کائنات کے جملہ کمالات خدا کی ذات سے مخصوص ہیں، مثلاً درج ذیل آیتوں کو ملاحظہ فرمائیں:

"اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی"[1]

وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں، اسی کے لئے اسمائے حسنیٰ ہیں۔

"وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ"[2]

اور انہیں خوب معلوم ہے کہ اللہ ہی کی ذات واضح و روشن حق ہے۔

"ھُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ"[3]

وہی (اللہ) واقعی زندہ ہے، اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے۔

"وَھُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ"[4]

اور وہی (اللہ) بہت جاننے والا اور نہایت قدرت والا ہے۔

"اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰہِ جَمِيْعًا"[5]

ساری قوت و طاقت خدا کی ذات سے مخصوص ہے۔

---

۱ سورۂ طٰہٰ، آیت: ۸۔

۲ سورۂ نور، آیت: ۲۵۔

۳ سورۂ مومن، آیت: ۶۵۔

۴ سورۂ روم آیت نمبر ۵۴۔

۵ سورۂ بقرہ، آیت: ۱۶۵۔

"اَنَ القُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیعًا لَہُ المُلکُ وَ لَہُ الحَمدُ"[۱]

بے شک تمام قوتیں خدا کی ذات سے مخصوص ہیں، اسی کے لئے ملک اور حمد وثنا ہے۔

"اِنَ العِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیعًا"[۲]

بے شک ساری عزت خدا کی ذات سے مخصوص ہے۔

"یَا اَیُّھَا النَّاسُ اَنتُمُ الفُقَرَاءُ اِلَی اللّٰہِ وَ اللّٰہُ ھُوَ الغَنِیُّ الحَمِیدُ"[۳]

اے لوگو! تم سب کے سب خدا کے فقیر اور اس کے محتاج ہو اور صرف اللہ کی ذات ہے جو غنی اور حمید (جس کی حمد کی جائے) ہے۔

مذکورہ چند آیتیں قرآن کی بے شمار ان آیتوں میں سے ہیں جن میں واضح وروشن اور کسی ابہام کے بغیر اس بات کا اعلان کیا گیا ہے کہ خدا کی منزہ ذات ہر کمال اور وصف کی مالک ہے اور اس بات کا بھی اعلان کیا جا رہا ہے کہ اس کے غیر کو کمالات کا معمولی حصہ بھی نصیب نہیں ہے مگر یہ کہ جسے خدا نے خود عنایت کیا ہو اور اس کی عنایتیں اور عطائیں اس کے شامل حال ہوئی ہوں، اس لئے کہ ہمارے مالک ہونے اور خدا کے مالک ہونے میں بہت فرق ہے، کیوں کہ جب ہم کسی چیز کو دوسرے کی ملکیت میں دیتے ہیں تو گویا پہلے اس چیز کو اپنی ملکیت سے خارج کرتے ہیں پھر دوسرے کو اس کا مالک بناتے ہیں اور اس کے مالک ہونے کے بعد پھر ہم اس کے مالک نہیں ہو سکتے لیکن خدا کے لئے ایسا تصور غیر ممکن ہے اس لئے کہ جملہ خلائق خدا کی مخلوقات ہیں اور سب کچھ اسی کے ہاتھ میں ہے اور ہم سب کے سب خدا کے مملوک ہیں اور وہ ہمارا مالک ہے"۔[۴]

---

[۱] سورۂ تغابن، آیت:۱۔

[۲] سورۂ یونس، آیت:۶۵۔

[۳] سورۂ فاطر، آیت:۱۵۔

[۴] ج۶،ص ۱۳۱،۱۲۸

توحید میں اخلاص

سورۂ اخلاص حقیقت میں خدا کی وحدانیت کے باب میں بہترین اور جامع طور پر توحید خالص کرتا ہے۔

قل هو الله احد

کلمہ ''ھو'' ضمیر شان یا ضمیر قصہ ہے اور معمولاً اس ضمیر کا استعمال ہمیشہ اس وقت کیا جاتا ہے جب بعد والا مضمون بہت اہم ہو اور متکلم اس کی اہمیت کو بیان کرنے کے درپے ہو۔

''... کلمہ ''احد'' اور کلمہ ''واحد'' میں فرق پایا جاتا ہے، کلمہ ''احد'' کو ہمیشہ اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جس میں تعدد کا تصور نہ پایا جاتا ہو اور وہ کثرت کے قابل نہ ہو نہ ذہنی اعتبار سے اور نہ ہی غیر ذہنی اعتبار سے۔

کلمہ ''واحد'' اس مقولہ سے باہر ہے اس لئے کہ ہر واحد کا ایک ثانی اور ثالث یعنی خارج میں یا وہم وگمان میں یا عقلی فرضیات کی روشنی میں ایک کے بعد دوسرے اور تیسرے کا تصور پایا جاتا ہے اور یہ تعداد ایک کے بعد دو، تین اور چار یا اس سے زیادہ تک پہنچ سکتی ہے۔

لیکن اگر احد کے لئے کوئی دوسرا فرض کیا جائے تو وہ خود ہی ہوگا اور اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

''اس مطلب کو جو مثال سب سے زیادہ واضح کر سکتی ہے یہ ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ (لوگوں میں کوئی ایک (احد) بھی میرے پاس نہیں آیا) درحقیقت اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے جہاں ایک شخص کی آمد کا انکار کیا ہے وہیں ایک سے زیادہ لوگوں کی آمد کا بھی انکار کر رہا ہوں اور اگر یہ کہا جائے کہ لوگوں میں کوئی ایک (واحد) بھی میرے پاس نہیں آیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے صرف ایک شخص کے آنے کا انکار کیا ہے لیکن ممکن ہے کہ ایک سے زیادہ آئے ہوں۔

کلمہ ''احد'' اسی تفاوت اور خصوصیت کی بنا پر کہ جو اپنے اندر رکھتا ہے کسی بھی ایجابی کلام

میں وارد نہیں ہوا ہے، صرف اور صرف خدا کے سلسلہ میں استعمال ہوتا ہے...

مولا امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے خوبصورت بیانات میں سے ایک بیان ملاحظہ فرمائیں:

''کُلُّ مُسَمًّی بِالْوَحْدَةِ غَیْرُهُ قَلِیلٌ'' جب بھی کسی غیر خدا کو صفت وحدت سے متصف کیا جاتا ہے اور اس کی تعریف کی جاتی ہے تو یہ تعریفِ وحدت اس کی کمی اور نقص پر دلالت کرتی ہے لیکن جب خدا کے لئے اسی وحدت کو استعمال کیا جاتا ہے تو یہ اس کے کمال کی نشانی ہے۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ خدا کی وحدانیت کو ہمیشہ کلمہ ''احد'' کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے یعنی غیر خدا میں سے جس کا بھی نام لیا جائے تو وہ کچھ بھی نہ ہوگا لیکن اگر خدا کی وحدانیت کو کلمہ ''واحد'' کے ذریعہ متصف کیا جائے تو وہ واحد غیر عددی ہے اور اس مرتبہ میں غیر خدا میں سے کسی کا نام لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی کوئی موجودیت نہیں ہے بلکہ پوری طرح وہ خدا سے وابستہ ہے اور اسی کی طرف سے ہے اور وہ صرف بے نیاز خدا کا فقیر اور نیازمند ہے، اسی لئے جو ایک مرتبہ مقام احدیت پر فائز ہو جائے تو اس کے پیروں سے تیر بھی نکال لئے جائیں تو اسے احساس نہ ہوگا۔

''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' یعنی کہو فقط خدا ایسا یکتا ہے جس کے بعد کوئی نہیں اور وہ اپنے وجود میں کوئی نظیر نہیں رکھتا۔

پیش بی حد ہر چہ محدود است لا ست   کل شیء غیر وجہ اللہ فناست

اللہ الصمد

کلمہ ''صمد'' کے معنی قصد کرنے یا اعتماد کے ساتھ قصد کرنے کے ہیں...

جب خداوند عالم نے پوری کائنات کو خلق فرمایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز اپنی

---

[1] ج ۲۰، ص ۶۷۰، ۶۷۱

ذات، صفات اور افعال کے اعتبار سے اس کی محتاج اور نیاز مند ہے بلکہ اپنی ہر حاجت کو پورا کرنے کے لئے اسی سے تعلق کی محتاج ہے جیسا کہ وہ خود قرآن مجید میں فرماتا ہے:

"اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ"۔[۱]

جان لو کہ خلق یعنی دو عالم اور امر یعنی ملک وملکوت سب کا سب خدا کی ملکیت اور اسی کا ہے۔[۲]

ایک روایت میں امام حسین بن علی علیہما السلام میں فرماتے ہیں:

صمد اس شخص یا چیز کو کہتے ہیں جو اندر سے خالی اور کھوکھلی نہیں ہوتی...[۳]"

اس کلمہ کے سلسلہ میں جو معانی مختلف روایتوں اور حدیثوں میں وارد ہوئے ہیں ان سب کے درمیان یہ آخری معنی ہر ایک سے زیادہ مورد توجہ واقع رہا ہے، صمد یعنی بھرا ہوا، ٹھوس، یہ ایک ایسا معنی ہے جس میں اس کے بقیہ معانی بھی شامل ہوجاتے ہیں، خداوند عالم اس کائنات پر محیط اور چھایا ہوا ہے لیکن اس کا احاطہ کناروں اور حاشیوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر چیز کے وجود کو اپنے اختیار میں لئے ہوئے ہے، وہ ہر جگہ ہے اور کوئی بھی چیز اس کے مقابلے میں نہیں ہے، اس کے لئے کوئی نظیر اور نعم البدل نہیں ہے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے جتنا کھولنے کی کوشش کی جائے اتنا ہی اس میں پیچیدگیاں بڑھتی جائیں گی، بس افسوس یہ ہے کہ اس نکتہ کی اس حد تک آشکار ہونے کے باوجود فہم وشعور درک کرنے سے عاجز ہیں۔

حضرت امام خمینیؒ نے اسی مطلب کو کتنے اچھی شعری پیرائے میں کہا ہے:

جز ہستی دوست در جہان نتوان یافت در نیست نشانہ ای ز جان نتوان یافت

---

۱ سورۂ اعراف، آیت: ۵۴۔

۲ ج ۲۰، ص ۶۷۱

۳ ج ۲۰، ص ۶۷۷، معانی الاخبار، ص ۷

در خانہ اگر کس است یک حرف بس است   در کون و مکان بہ غیر آن نتوان یافت

ہاں! اسے سکوت کے حیران خانہ میں ڈھونڈھنا چاہیئے اور خودی کی معرفت کے ذریعہ خدا کی معرفت تک پہنچنا چاہیئے:

راز پنہان است اندر زیر و بم   فاش اگر گویم جہان بر ہم زنم

ہم نے گذشتہ سطور میں ایک روایت کو بیان کیا تھا جسے یہاں دہرانا چاہتے ہیں:

آیۂ شریفہ:

''وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ'' کے سلسلہ میں امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام فرماتے ہیں:

خداوند عالم احد اور صمد ہے اور صمد اس چیز کو کہتے ہیں جس کا جوف (اندر) خالی نہ ہو بلکہ بھرا ہوا ہو، پس روح اس کی مخلوقات کے درمیان ایک ایسی مخلوق ہے جس کی آنکھیں ہیں اور اسے خالق کی پشت پناہی حاصل ہے اور خدا اسے اپنے انبیاء اور ایمانداروں کے دلوں میں جگہ دیتا ہے''۔[1]

معصوم کی مذکورہ تفسیر میں ایک احتمال جو پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ جب روایت میں روح کو ایک مخلوق کا نام دیا گیا ہے اور یہ روح خدا کی صمدیت اور واحدیت کا اثر ہے تو اس نکتہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ روح مطلق جو خدا کے جملہ اسماء وصفات اور افعال کا مظہر ہے اور انسانوں سے مخصوص ہے، اس سے خدا کی احدیت اور صمدیت بھی متجلی ہوتی ہے یعنی روح مطلق نے کائنات کے ذرہ ذرہ اور چپہ چپہ کو اپنے وجود سے مامور بنا دیا ہے جس کا کوئی مانند نہیں ہے، پس ایک انسان روح اور روحانیت کے اس مرحلہ تک صعود کے ذریعہ اپنے وجود میں تمام اسماء اور صفات کو سمیٹ سکتا ہے اور خدائی کام انجام دے سکتا ہے بلکہ ایک جملہ میں کہا جائے تو یہ کہنا مناسب ہوگا کہ انسان اس مرحلہ میں ''وجہ اللہ'' کا کامل مصداق بن سکتا ہے اور اس وقت اس کی

---

[1] ج ۱۳، ص ۲۹۵، از تفسیر عیاشی ج ۲، ص ۳۱۶

روح خدا کی جانب سے ''وَ نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي'' نہیں ہوگی بلکہ ''نَفَخْتُ فِيهِ رُوحِي'' ہوگی اور یہ وہی منزل ہے جسے ہم خودی کی معرفت اور عرفانی خودشناسی کے نتیجے کی انتہا کہتے ہیں۔

روح مطلق

ابھی تک ہم نے روح کے سلسلہ میں بہت سے گرانقدر معانی اور معارف حاصل کئے لہٰذا انہیں دہرانے اور دوبارہ ذہن نشین کرنے کے لئے بیان کرنا لازم وضروری سمجھتے ہیں، روح ایک واحد حقیقت اور بے نظیر مخلوق کا نام ہے اور قرآن نے اسے ہمیشہ مفرد کی شکل میں استعمال کیا ہے اور ہرگز کہیں بھی اس کی جمع ''ارواح'' استعمال نہیں کی۔

لیکن یہ حقیقت واحد، یکتا اور نا محدود مختلف شکلوں اور مظاہر کی حامل ہے، روح مطلق جو روح الٰہی ہے حقیقت میں نور حق ہے جس نے پوری کائنات کو روشن بنا رکھا ہے اور اس کو زندگی کا وجود عطا کیا ہے۔

تمام ملائکہ اور فرشتے سب کے سب اسی روح کے پرتو ہیں، یہ روح تمام ملائکہ یہاں تک کہ مقرب فرشتے جیسے حضرت جبرئیل وغیرہ سے بھی زیادہ منزلت اور درجہ کی مالک ہے، اسی طرح انسانوں کی بھی روح اسی روح مطلق کا ایک پرتو اور جھلک ہے نیز اس کائنات میں موجود تمام حیوانات اور نباتات بھی اسی روح مطلق کے جلوے کا اثر ہیں اور ان کی زندگی اسی سے وابستہ ہے۔

روح مطلق خدا سے وابستہ، اس کی ذات میں فانی اور نور الٰہی کے لئے پوری طرح آئینہ ہے، اسی لئے ملائکہ اپنے گفتار وکردار کے اعتبار سے ہرگز خدا کے حکم اور ارادہ سے تجاوز نہیں کرتے اور ان میں بغاوت کا عنصر نہیں پایا جاتا۔

''لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ''

روح، ملکوت کی جان ہے بلکہ خدا کا علم، قدرت، نور، حیات، جمال اور جلال ہے اور اس نے ارکان عالم کو اپنے نورانی وجود کے ذریعہ مامور بنا رکھا ہے۔

یہ پوری کائنات جہاں ایک طرف اپنا رخ عالم بالا اور حق کی جانب کئے ہوئے ہے وہیں دوسرا رخ مخلوقات کی جانب بھی کئے ہوئے ہے، اس کا آسمانی چہرہ جسے باطن عالم کہا جاتا ہے ، وہ حقیقت میں خدا کی آیت اور اس کا آئینہ ہے جس کے ذریعہ خدا کے اسماء اور انوار متجلی ہوتے ہیں، اسی وجہ سے عالم کو علامت اور نشانی کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے اس لئے کہ اس کائنات کی ہر مخلوق حقیقت میں حقیقت ازلی کو بیان کرتی ہے اور باطنی چہرہ جو حق کی جانب ہے، اس اعتبار سے یہ پوری ہستی اور کائنات خدا کی حمد و تسبیح میں مشغول ہے، پس معلوم ہوا کہ یہ پوری کائنات روح مطلق کی حیات، قدرت اور نور وشعور کے ذریعہ باحیات، منور، پرقدرت اور ذی شعور ہے اور دائم حق تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کر رہی ہے۔

ہم انسان اس مادی دنیا میں آنے سے پہلے، اس کی محدودیتوں، رکاوٹوں اور قید و بند میں وارد ہونے سے قبل روح مطلق کی برکت سے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے جمال پرنور کے نظارے میں مشغول تھے اور جب یہ دنیاوی عمر اپنی آخری لمحات کو پہنچے گی اور اس دار فنا کا حساب و کتاب کامل ہو جائے گا تو اس وقت دوبارہ حق تعالیٰ کے لازوال حضور کو روح مطلق کی وسعت میں پائیں گے، اگر چہ آج بھی ایسے انسان ہیں جن کا جسم اس دنیا میں رہتا ہے لیکن ان کی روح اس دنیا کی قید و بند سے آزاد ہو کر روح مطلق میں فنا ہو چکی ہے اور اسی حال میں خداوند مقتدر کی بارگاہ میں محو جمال ہیں۔

انسان اپنی خودی کی معرفت کی راہ میں عالم باطن اور ملکوت تک سیر کرتا ہے اور اسی سیر میں ہمیشہ وہ اپنے پروردگار کے ساتھ ہوتا ہے اور اپنے وجود کے آئینے میں اپنے پروردگار کو دیکھتا اور پہچانتا ہے، اس کے بعد وہ اپنی مادی حدوں سے گذرتا ہے اور روح مطلق کی نور افشانی سے ملحق ہو جاتا ہے، اس حال میں وہ پوری کائنات کو خدا کے زیر اثر اور اس کی حمد و ثنا میں مشغول دیکھتا ہے اور آسمان و زمین کے ملکوت کا نظارہ کرتا ہے۔

بعض نکات مخصوصاً وہ نکات جو خداوند عالم کے اسماء وصفات اور افعال سے متعلق ہیں وہ بہت پیچیدہ ہیں لہٰذا انہیں سمجھنے کے لئے جلد بازی کسی بھی حال میں سودمند نہیں ہے، جس طرح مذکورہ مسائل سے متعلق نکات کو سطحی طور پر سمجھنا بھی درست نہیں ہے اسی طرح نادانی کی وجہ سے انکار اور جاہلانہ کفر بھی خطا ہے۔

لیکن روح مطلق کے مسائل اور نکات جو خدا کی بلاواسطہ سب سے پہلی مخلوق ہے اور اس نے کسی واسطہ کے بغیر اسے خلق فرمایا ہے، ایک حد تک مبہم اور پیچیدہ ہیں، اسی لئے فلاسفہ اور عرفاء نے اس بے نظیر حقیقت کو سمجھانے اور اس کے مبہمات کو حل کرنے کے لئے فراواں کوششیں انجام دی ہیں۔

خداوند عالم قرآن کریم میں فرماتا ہے:

"وَمَا اَمرُنَا اِلَّا وَاحِدَۃٌ کَلَمحٍ بِالبَصَرِ"

یعنی ہمارا امر ایک ہے اور اس کا فعلیت کی منزل میں وارد ہونا اور انجام پانا زمانہ اور وقت کا محتاج نہیں بلکہ صرف "کن فیکون" کے ارادے سے متحقق ہوجاتا ہے۔

مذکورہ آیت اور اسی جیسی بہت سی آیتوں کے سلسلہ میں ہم نے گفتگو کی، ان تمام آیتوں کے مطالعہ کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خدا کا صرف اور صرف ایک ہی امر ہے، ایک ایسی مخلوق ہے جو ہر قسم کی قید و بند یعنی زمان و مکان کی بندشوں سے آزاد ہے اس لئے کہ عالم امر ایک الٰہی عالم ہے اور اسی کے پاس ہے، یہی وہ مخلوق ہے جو ہر مخلوق سے برتر اور زمان و مکان کی محدودیتوں سے آزاد ہے۔

یہ وہی روح مطلق ہے جس کی حقیقت عالم ملکوت یا عالم امر ہے، روح مطلق کی کوئی حد نہیں ہے، وہ تو صرف اور صرف اپنے پروردگار سے وابستہ، اس میں فنا اور اس کی ذات سے غنی ہے اور اس کائنات کے ذرہ ذرہ اور چپہ چپہ میں موجود ہے، اس کائنات کی تمام مخلوقات، نباتات

حیوانات، انسان، ملائکہ غرض کہ ہر مخلوق کی جان اور حیات اسی سے ہے اور ہر ایک کی زندگی اسی کا نذرانہ ہے، ہر شئ روح مطلق کے بے کراں سمندر میں غوطہ زن ہے، یہی روح مطلق زمین و آسمان کے پیوند کا باعث ہے اور آسمانوں کا معلق رہنا بھی اسی روح کی مدد سے ہے، خدا کی غیبی ذات نے کہ جس تک کسی معرفت کو رسائی کا یارا نہیں ہے، اپنے عشق کی بنیاد پر پنہاں کمال کو روح مطلق کی خلقت کا فرمان دیا تا کہ حق کی سربستہ حقیقت کے لئے آئینۂ کامل قرار پائے اور اس کا خلیفہ بن سکے۔

انسان کی حقیقت اور اس کا اصلی جوہر روح مطلق ہے، سارے انسان خدا کی معرفت اور اپنے دل کی طہارت کے ذریعہ اسے بدل سکتے ہیں اور اسے ایسی وسعت عطا کر سکتے ہیں جو اپنی حدودں سے گذر کر روح مطلق کی بارگاہ تک شرفیاب ہو سکے، روح مطلق جو اولاً و بالذات ہے وہ حضرت محمد مصطفیؐ کا مقام ہے، جیسا کہ آپؐ نے فرمایا:

"اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ اَوْ رُوْحِیْ"۔[1]

سب سے پہلے خدا نے میرے نور یا میری روح کو خلق فرمایا۔

یعنی خداوند رحیم کی سب سے پہلی مخلوق میرا نور یا میری روح ہے، آپؐ کے بعد اس مقام و منصب کے اہل، حقیقت میں اہلبیت عصمت و طہارت علیہم السلام ہیں لیکن یہ وہ مقام ہے کہ جس تک پہنچنے کا راستہ ذوات مقدسہ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر ایک کے لئے کھلا ہوا ہے، جو بھی چاہے اپنی کوششوں کے ذریعہ اس مقام تک پہنچ سکتا ہے۔

روح مطلق جو حقیقت میں خدا کی سب سے پہلی اور منفرد مخلوق ہے، اس کے بعد تمام مخلوقات بھی اسی کا ایک جلوہ اور اثر ہیں، اس روح کی حقیقت اور صورت انسان ہے اور جب ایک انسان اس منزل پر فائز ہو جاتا ہے تو پوری کائنات کو اپنی ذات کے پرتو میں مشاہدہ کرتا ہے اور

---

[1] بحار الانوار، ج ۱۵، ص ۲۰۴، نیز ج ۲۵ ص ۲۲

اس مقام پر فائز ہونے والا تمام ان انسانوں کو جو اس مقام پر پہنچ چکے ہیں ایک قالب میں نظارہ کرتا ہے جیسا کہ اہلبیت علیہم السلام کی شان میں وارد ہوا ہے:

"کُلُّهُمْ نُوْرٌ وَاحِدٌ"۔

وہ (اہل بیتؑ) سب کے سب ایک ہی نور سے ہیں۔

امام معصوم علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَوَّلُنَا مُحَمَّدٌ وَ آخِرُنَا مُحَمَّدٌ وَ اَوْسَطُنَا مُحَمَّدٌ وَ كُلُّنَا مُحَمَّدٌ"۔[1]

ہمارا پہلا بھی محمد ہے، آخری بھی محمد، اوسط بھی محمد ہے بلکہ ہم سب کے سب محمد ہیں۔

ہر انسان کو چاہیئے کہ وہ خودی کی معرفت اور خودسازی وتربیت کی طرف قدم بڑھائے تاکہ وجہ مطلق الٰہی تک پہنچ سکے جس نے تمام اسماء وصفات اور افعال الٰہی کو اپنے احاطہ

---

[1] بحار ج ۲۶، ص ۱۶، غیبۃ نعمانی، ص ۸۵) فقال ع سلهم هل يقدر على ابن الحسين ان يصير صورة ابنه محمد قال جابر فسالتهم فامسكوا و سكتوا قال ع يا جابر سلهم هل يقدر محمد ان يصير بصورتی؟ قال جابر: فسالتهم فامسكوا و سكتوا، قال فنظر الی و قالؑ يا جابر! هذا ما اخبرتک انهم قد بقي عليهم بقية فقلت لهم ما لكم ما تجيبون امامكم؟ فسكتوا و شكوا فنظر اليهم و قال يا جابر هذا ما اخبرتک به قد بقيت عليهم بقية و قال الباقر ع ما لكم لا تنطقون فنظر بعضهم الى بعض يتسائلون قالوا: يا ابن رسول الله لا علم لنا فعلمنا قال فنظر الامام سيد العابدين على بن الحسين ع الى ابنه محمد الباقر ع و قال: لهم من هذا قالوا: ابنک فقال لهم من انا؟ قال ابوه على ابن الحسين ع قال فتكلم بكلام لم نفهم فاذا محمد بصورة ابيه على ابن الحسين و اذا على بصورة ابنه محمد قالوا: لا اله الا الله فقال الامام ع لا تعجبوا من قدرة الله انا محمد و محمد انا و قال: محمد يا قول لا تعجبوا من امر الله انا على و على انا و كلنا واحد من نور واحد و روحنا من امر الله اولنا محمد و اوسطنا محمد و آخرنا محمد و كلنا محمد قال: فلما سمعوا ذلک خروا لوجوههم سجدا و هم يقولون آمنا بولايتكم و بسركم و بعلانيتكم و اقررنا بخصائصكم فقال الامام زين العابدين: يا قوم ارفع ارفعوا رؤسكم فانتم الان العارفون الفائزون المستبصرون و انتم الكاملون البالغون الله الله لا تطلعوا احدا من المقصرين المستضعفين على ما رايتم منى۔

میں لے رکھا ہے اس لئے کہ انہیں اسماء سے آشنائی اور ان سے مطلع ہونا برتری کا معیار اور خلافت الٰہی کے استحقاق کا باعث ہے۔

خواست ببیند بہ جہان صورت خویش خیمہ در آب و گل مزرعہ آدم زد

یہی وہ انسان ہے جس کے وجود میں خداوند متعال اپنے انوار اور اسماء کو متجلی کیا ہے اور اس میں ودیعت کیا ہے، اسے زمین پر اور اپنی تمام مخلوقات کے لئے اپنا جانشین مقرر کیا ہے۔

انسان خدا کا جانشین

”وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلَائِکَۃِ اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِکُ الدِّمَاءَ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ“۔

اور جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے کہا: میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے جارہا ہوں تو فرشتوں نے کہا:

کیا تو اسے خلیفہ بنانا چاہتا ہے جو زمیں پر فساد برپا کرے اور خون بہائے جب کہ ہم تیری حمد وثنا اور تسبیح وتقدیس کرتے ہیں۔

مذکورہ آیت میں خداوند عالم نے اپنے فرشتوں کا جو جواب پیش کیا ہے اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ وہ لوگ خدا کی بات سے کہ میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ خدا کا زمین پر ایک خلیفہ بنانا وہاں فساد اور خونریزی کا باعث بنے گا، اس لئے کہ انہیں معلوم تھا کہ جہاں ایک طرف مادی اور زمینی مخلوق شہوت وغضب کے خمیر سے مل کر بنی ہوگی تو دوسری طرف زمین کے اسباب محدود اور بے شمار بندشوں میں گھری ہوں گے، مشکلات قدم قدم پر ہوں گی، اس کا نظام کمزور اور فرسودہ ہوگا اور اس کی اصلاح بہت دشوار ہوگی لہٰذا وہاں کی زندگی اجتماعی ہوگی اور ایسی زندگی میں بقا کو اجتماعی زندگی کے بغیر ہرگز کمال نہیں مل سکتا پس ایسی زندگی میں لامحالہ فساد ہوگا اور ہر طرف خونریزی ہوگی۔

جب کہ مقام خلافت جیسا کہ اس کے نام سے سمجھ میں آتا ہے، اس وقت تک محقق نہیں ہوسکتا جب تک کہ کوئی ایسا انسان خدا کا جانشین بن کر اس مقام کا عہدہ دار نہیں ہوتا کہ جس میں الٰہی اسماء وصفات کی جھلکیاں نہ پائی جاتی ہوں، اسی لئے خالق نے اس ہدف کو پورا کرنے کے لئے اور اپنی تدبیر واحکام کے لئے اپنا جانشین مقرر فرمایا ہے۔

انسان جس مقام پر بیٹھا ہوا ہے وہ مقام خدوند عالم کا ہے جسے اسمائے حسنیٰ اور جلال و جمال جیسے عظیم ناموں سے جانا جاتا ہے، وہ اپنی ذات کے اعتبار سے ہر قسم کے عیب ونقص اور اپنے افعال کے اعتبار سے ہر شر وفساد سے منزّہ ہے۔

''جَلَّتْ عَظَمَتُهُ''۔

وہ صاحب جلالت وعظمت ہے۔

وہ انسان جو زمین پر اس کے مادی آثار کے ساتھ زندگی گذارے گا وہ ہرگز خلافت الٰہیہ کی لیاقت نہیں رکھ سکتا۔۔۔ یہ ان فرشتوں کی باتیں تھیں جنہوں نے ایک ایسی چیز ی کے سلسلہ میں سوال کرلیا کہ جسے وہ ہرگز نہیں جانتے تھے لہٰذا وہ زمین پر انسان کی خلافت کے سلسلہ میں موجود اشکال کو حل کرنا چاہتے تھے اور ہرگز ان کا ارادہ فعل الٰہی میں اعتراض اور اس میں خلل ڈالنا نہیں تھا، اس مدعا کی دلیل وہ جملہ ہے جسے انہوں نے کہا اور قرآن نے نقل فرمایا:

''اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ''۔

بے شک تو ہی سب سے زیادہ جاننے والا اور نہایت حکمت والا ہے۔

اس جملہ میں حرف ''ان'' تعلیل شدہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے خدا کے ارادے کو صحیح اور مسلم جانتے تھے اور اس سلسلہ میں انہیں کوئی شک نہیں تھا۔

پس ان کی پوری بحث کا خلاصہ اس معنی کی طرف برگشت کرتا ہے کہ خلیفہ بنانے کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ خدا کا وہ خلیفہ اور جانشین اپنی زبانی اور وجودی تسبیح وتقدیس کے ذریعہ خدا

کا جانشین نظر آئے جب کہ دنیاوی زندگی اسے اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دے گی بلکہ اسے فساد اور خونریزی کی طرف لے جائے گی۔

اس کے علاوہ زمین پر خلیفہ بنانے کا مقصد جب اس معنی میں خدا کی تسبیح و تقدیس کرنا ہے تو وہ مقصد تو خود ہم فرشتوں کی تسبیح و تقدیس سے حاصل ہے لہٰذا ہم ہی تیرے خلیفہ ہیں یا ہمیں اس مخلوق کی جگہ اپنا خلیفہ بنا دے، ایسے میں اس زمینی خلیفہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟

خداوند عالم ملائکہ کی اس بات کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے:

"اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا"۔[1]

بے شک جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے اور اللہ نے آدم کو تمام اسماء کی تعلیم مرحمت فرمائی۔

مذکورہ آیت کا سیاق اور مطلب دو نکتہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے:

پہلا نکتہ: یہ ہے کہ جناب آدم کی خلافت سے مراد زمین پر خدا کا خلیفہ ہونا تھا نہ یہ کہ خدا نے ارادہ فرمایا ہو کہ جناب آدم زمین کی سابق مخلوق کے جانشین بنیں جو اس وقت تک ختم ہو چکے تھے، یہ وہ بات ہے جس کی طرف بعض مفسروں نے اشارہ کیا ہے اور اس قول کو قبول بھی کیا ہے لیکن یہ احتمال صحیح نہیں ہو سکتا اس لئے کہ خدا نے فرشتوں کے جواب میں جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے آدم کو اسماء کی تعلیم دی ہے، اس کے بعد فرمایا ہے:

"اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ"۔

انہیں ان اسماء کی خبر دے دو۔

اس جملہ کے پیش نظر مذکورہ احتمال کسی بھی حال میں صحیح نہیں ہو سکتا۔

پس معلوم ہوا کہ وہ خلافت صرف اور صرف حضرت آدم سے مخصوص نہیں تھی بلکہ ان کی

---

[1] سورۂ بقرہ آیت نمبر ۳۰، ۳۱

اولاد بھی اس منصب میں ان کی برابر کی شریک ہے، اس نکتہ کی روشنی میں تعلیم اسماء کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا نے اس علم کو انسان کی طینت میں ودیعہ کر دیا ہے جس کی بنا پر اس کے آثار کبھی کبھی انسانوں سے ظہور پذیر ہوتے ہیں، جب بھی وہ صحیح راستے سے آئے اور ہدایت پائے تو اس ودیعۂ الٰہی کو قوت کے مرحلہ سے فعلیت کے مرحلہ میں لا سکے۔

خلافت کی عمومیت کی سب سے بہترین دلیل درج ذیل آیات ہیں:

"اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ"۔[1]

اس نے تمہیں قوم نوحؑ کے بعد جانشین بنایا۔

"ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْاَرْضِ"۔[2]

پھر اس نے تمہیں زمین پر اپنا خلیفہ بنایا۔

"يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ"۔[3]

وہ تمہیں زمین کا خلیفہ بنائے گا۔

دوسرا نکتہ: یہ ہے کہ خداوند عالم فرشتوں کی بات کا جواب اور اسے رد کرنے کے لئے زمین پر فساد اور خونریزی کا انکار نہیں کر رہا ہے کہ وہ زمین پر فساد اور خونریزی برپا نہیں کریں گے بلکہ کچھ نہ کہہ کر گویا زمین پر ان کے فتنہ و فساد اور خونریزی کی تائید بھی کر رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ایک دوسرے مطلب کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے کہ اس امر الٰہی میں ایک مصلحت خوابیدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اس امر کی لیاقت فرشتوں میں نہیں ہے لیکن اس زمینی مخلوق میں اسے سمجھنے اور حمل کرنے کی تاب و توان بھرپور ہے۔ ہاں! انسان خدا کے کمالات کی تجلی گاہ ہے اور ایسے اسرار کا

---

[1] سورۂ اعراف، آیت: ۶۹۔

[2] سورۂ یونس، آیت: ۱۴۔

[3] سورۂ نمل، آیت: ۶۲۔

حامل ہے جسے یہ فرشتے ہرگز تحمل نہیں کر سکتے۔

یہ ایک ایسی عظیم اور با اہمیت مصلحت ہے جو شر و فساد اور خونریزی کا جبران کر سکتی ہے خداوند عالم نے فرشتوں کو جواب دیتے ہوئے سب سے پہلے فرمایا:

"اِنِیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ"۔

بے شک میں جو کچھ جانتا ہوں اس سے تم بے خبر ہو۔

پس جب ان فرشتوں سے اسماء کے سلسلہ میں سوال کیا گیا اور اس موضوع سے متعلق ان کی نادانی و جہالت کا اندازہ ہوا تو فرمایا:

"اَلَمْ اَقُلْ لَکُمْ اِنِّی اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ"۔

کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں زمین و آسمان کے غیب سے واقف ہوں۔

اس آیت میں غیب سے مراد جناب آدم علیہ السلام کا اسماء کے بارے میں علم نہیں ہے بلکہ خود اسماء ہیں اس لئے کہ فرشتوں کو ان اسماء سے متعلق کوئی علم نہیں تھا اور وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ آدم ان اسماء سے مطلع ہیں، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کا فرشتوں سے سوال کرنا بے جا ہوتا (بلکہ جناب آدمؑ کو اسماء سے مطلع کر دینا ہی کافی تھا، اس بات سے دو باتیں سمجھ میں آتی ہیں:)

پہلا نکتہ یہ کہ فرشتوں کو جناب آدمؑ کی خلافت کے سلسلہ میں سوال کرنا اسماء سے بے اطلاعی و بے خبری کی وجہ سے ہے۔

دوسرا نکتہ یہ کہ خدا نے فرشتوں سے کہا:

"اَنْبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰؤُلَآءِ"۔

مجھے ان اسماء کے بارے میں خبر دو۔

اس جملہ کے سیاق سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ فرشتے، منصب خلافت کے تصاحب کے دعویدار تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ انسانوں میں منصب خلافت کی لیاقت نہیں ہے، اس کے

علاوہ اس منصب پر بیٹھنے کالازمہ یہ ہے کہ خدا کا خلیفہ ان اسماء سے باخبر ہو، پس خدا نے فرشتوں سے ان اسماء کے سلسلہ میں سوال کیا اور انہوں نے جواب میں عدم اطلاع کی خبر دی اور جب آدم سے ان اسماء کے سلسلہ میں سوال کیا تو انہوں نے وہ اسماء بتادیئے اور اس طرح اس منصب سے متعلق جناب آدم کی لیاقت اور فرشتوں کی بے لیاقتی ثابت ہوگئی۔

اس کے علاوہ دوسرا نکتہ جو سمجھ میں آرہا ہے وہ یہ ہے کہ خدا نے اپنے سوال میں اس جملہ کو بڑھایا اور فرمایا:

''اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ''۔

اگر تم سچے ہو۔

اس جملہ سے سمجھ میں آرہا ہے کہ فرشتوں کا دعویٰ نہیں تھا اس لئے کہ انہوں نے ایک ایسا دعویٰ کیا جس کا لازمہ علم کا مالک ہونا ہے۔

''وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰئِكَةِ''۔

آدم کو تمام اسماء کی تعلیم دے دی پھر انہوں نے ان اسماء کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔

اس جملہ سے سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اسماء یا ان کے مسمیٰ ذی شعور اور زندہ موجودات تھے جو عالم غیب کے مکیں تھے اسی وجہ سے ان کے سلسلہ میں معلومات بالکل ویسے ہیں جیسا کہ ہمارا علم موجودات کے سلسلہ میں ہے۔ [اس لئے کہ علم حصولی ان ذہنی صورتوں کو کہتے ہیں جو صاحب حیات وشعور نہیں ہوتے اور ان کی طرف ضمیر ''ھم'' نہیں لوٹتی]، اور اگر ان کا علم ہمارے علم جیسا ہوتا تو جب آدم نے انہیں مذکورہ اسماء سے باخبر کیا تھا تو وہ بھی صاحب علم ہوجاتے اور ایسی صورت میں جناب آدم کو فرشتوں پر کوئی برتری حاصل نہ رہتی [جب کہ فرشتوں میں علم اسماء کے تحمل کی کوئی ظرفیت نہیں ہے اس لئے کہ خدا نے انہیں اسماء کی تعلیم نہیں دی ہے بلکہ بس اتنا فرمایا ہے:

''عَرَضَهُمْ'' اور انسانوں نے بھی انہیں ان اسماء سے مطلع نہیں کیا بلکہ صرف ان کی خبر

دی ہے۔ ''اَنْبِئْهُمْ''۔

نیز اگر اسماء کا مذکورہ علم ہمارے علوم کی طرح ہوتا تو فرشتوں کو اس بات پر قانع نہیں ہونا چاہیئے تھا کہ آدم کو ان اسماء کا علم ہے اور اس طرح ان کی دلیل بے بنیاد ثابت ہو اور اس ان کا استدلال باطل ہو جائے فرشتوں کی دلیل کو باطل کرنے کے لئے یہ کیسا استدلال کیا جا رہا ہے؟ کیوں کہ حق تعالیٰ آدم کو چند کلمات کی تعلیم دے کر فرشتوں کا امتحان لے رہا ہے اور اپنے اس شاہکار کی وجہ سے فخر و مباہات بھی کر رہا ہے اور انہیں، تمام فرشتوں سے بالاتر درجہ دے رہا ہے جب کہ بندگی کے اعتبار سے فرشتے اس بلند درجہ تک پہنچ چکے ہیں کہ:

''لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ''۔

جو خدا کے فرمان کی ہرگز ان دیکھی نہیں کرتے بلکہ اس کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کئے رہتے ہیں، اس نرالے انداز میں آدم کو برتری دے اور پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کرنے کے بعد اعلان کرے کہ یہ انسان میری جانشینی اور کرامت کے قابل ہے اور یہ لیاقت تمہارے اندر نہیں پائی جاتی، اس کے بعد مزید یہ بھی کہے کہ اگر تم اس فرمان کو قبول نہیں کرتے اور اپنے آپ کو خلافت کے لائق سمجھتے ہو یا اس مقام کے خواہشمند ہو تو مجھے ان کلمات اور جملات سے باخبر کرو جنہیں انسان آئندہ سالوں میں استعمال کرے گا اور اپنے لئے وضع کرے گا...

اس کے علاوہ کیا علم لغت کا فائدہ یہ نہیں ہے کہ سننے والا کلمات اور جملات کے ذریعہ کہنے والے کی بات اور اس کے باطنی مقصود کو سمجھ سکے؟ جب کہ فرشتے تکلم اور لغت کا سہارا لئے بغیر اور کسی بھی واسطے کے بغیر کسی کے بھی دل کی بات سے آگاہی حاصل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں پس یہ بات بالکل واضح ہے کہ فرشتوں کے پاس تکلم سے مافوق قدرت ہے۔

خلاصہ یہ کہ جو کچھ جناب آدم علیہ السلام کو نصیب ہوا تھا وہ حقیقت میں اسماء کے علوم کی حقیقت تھی جسے حاصل کرنا فرشتوں کی بساط سے باہر تھا اور اس طرح جناب آدم مقام خلافت کی

لیاقت کے مالک بنے اور اگر فرشتے جناب آدم علیہ السلام کی خبر اور تعلیم اسماء کے ذریعہ ان سے مطلع ہو گئے ہوتے تو پھر ان کا یہ کہنا بے جا ہوتا:

"سُبحَانَکَ لَا عِلمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمتَنَا"۔

اے پالنے والے! تو منزہ ہے اور ہمیں کوئی علم نہیں ہے مگر یہ کہ جو کچھ تو نے تعلیم دی ہے۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسماء کا علم ایسا ہو کہ جس کی مدد سے ان کے وجودی حقائق کشف ہوں، پس ان اسماء سے مراد ہرگز وہ اسماء نہیں ہیں جنہیں مختلف زبانوں کے جاننے والے اشیاء کو ان سے موسوم کرتے ہیں بلکہ وہ مسمّٰی حقیقت میں غیبی حقائق اور خارجی موجودات تھے اور ان کا تعلق ہرگز ذہنی موجودات سے نہیں تھا، یہ حقائق اور موجودات زمین و آسمان کے غیب و باطن میں تھے اور ان سے مطلع ہونا صرف اور صرف انسانوں کے بس میں تھا اور فرشتے اس لیاقت سے بے بہرہ تھے اور دوسری طرف وہ ایسا علم تھا جو خلافت الٰہیہ کے استحقاق میں موثر کردار پیش کرسکتا تھا۔ اس لئے کہ مقام خلافت کے لئے ایک ایسے وجود کی ضرورت ہے جو نہایت وسیع ہو اور بھرپور ظرفیت کا مالک ہو جو اپنے وجود کے ذریعہ تمام عوالم میں موجود ہو یعنی ناسوت کی پستیوں سے لاہوت کی بلندیوں تک تمام جگہوں کو اپنے وجود کے ذریعہ مامور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، جب ایسی لیاقت ہوگی تب حقائق عالم پر احاطہ اور تمام اسماء سے آشنائی ممکن ہے نہ یہ کہ ان فرشتوں جیسی مخلوق ہو کہ جو جبروت کے مکیں ہیں اور ان کی حدیں محدود ہیں۔[1]

علم اسماء

اسماء کے سلسلہ میں مزید وضاحت کی ضرورت کے پیش نظر یہ نکتہ بیان کرنا ضروری ہے کہ کلمہ ''الاسماء'' ادبیات عرب کی روشنی میں ایک ایسی جمع ہے جو الف و لام کے ساتھ آئی ہے جس

---

[1] ج۱، ص۱۷۷، ۱۷۸

سے افادۂ عموم ہوتا ہے اور اس عمومیت کو کلمہ ''کُلَّهَا'' کے ذریعہ تقویت ملتی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ تمام نام ہو سکتے ہیں جو ایک مسمیٰ کا نام واقع ہو سکتے ہیں اس لئے کہ اس جملہ میں نہ کوئی قید آئی ہے اور نہ کوئی عہد ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکے کہ اس سے مراد معہود نام ہیں البتہ علم الاسماء ان کی حقیقتوں سے آگاہی پر مشتمل تھا۔

... جب مذکورہ مسئلہ کو ان پہلوؤں سے دیکھتے ہیں یعنی اسماء کی عمومیت اور ان کے مسمیٰ کی حیات اور علم کو مدنظر قرار دیتے ہیں اور یہ بھی نظر میں رکھتے ہیں کہ وہ حقائق زمین و آسمان کے غیب و باطن میں ہیں اس وقت درج آیت کا مطلب ہمارے لئے پوری طرح ہویدا ہو جاتا ہے:

''وَاِنْ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ اِلَّا بِقَدَرٍ مَعْلُوْمٍ''۔

کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور ہم ان میں سے ایک معین مقدار ہی نازل کرتے ہیں۔

خداوند عالم اس آیت میں اس بات کی خبر دے رہا ہے کہ وہ تمام موجودات جن کے نام رکھے جاتے ہیں تا کہ وہ پہچان میں آسکیں، خدا کے پاس ان کے خزانے ہیں جن کی نہ کوئی حد ہے اور نہ وہ کبھی تمام ہونے والے ہیں اگر چہ یہ کمیت و کیفیت مرتبۂ نزول اور مادی دنیا میں قابل تصور ہے اور ان خزانوں میں جو کثرت بھی ہے ان میں مرتبہ اور درجہ ہے، پس نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ اسماء جنہیں ملائکہ کے سامنے پیش کیا وہ حقیقت میں زندہ اور صاحب شعور موجودات تھے، جو عالی رتبہ اور خدا کے خزانے تھے جنہیں خدا نے غیب کے حجابوں میں چھپا رکھا تھا اور خدا نے جو اسم بھی نازل کیا وہ حقیقت میں انہیں کے خیر و برکت کا اثر تھا اور زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے انہیں اسماء کے نور کا جلوہ اور اثر ہے، وہاں اگر چہ بے شمار موجودات ہیں لیکن ان کی کثرت عددی نہیں ہے اور ان کا تشخص جداگانہ نہیں ہے بلکہ سب کی حقیقت ایک ہی ہے بس درجے مختلف ہیں اور وہ بے شمار تجلیات کے مالک ہیں۔

ابو العباس، امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب میں نے امامؑ سے آیہ:

''وَ عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا'' کے سلسلہ میں سوال کیا کہ وہ اسماء کیا تھے؟ تو آپ نے فرمایا: وہ نام دواؤں، سبزیوں، جڑی بوٹیوں، درختوں اور زمین کے پہاڑوں کے نام تھے۔[۱]

داؤد بن سرحان عصار کہتے ہیں: ایک روز میں امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں تھا آپؑ نے دسترخوان لگانے کا حکم دیا اور ہم نے کھانا کھایا اور جب کھانا کھالیا تو حکم دیا کہ طشت اور تولیہ لایا جائے، میں نے عرض کیا: میں آپؑ پر قربان جاؤں، قرآن میں اسماء اور عَلَّمَ الْآدَمَ الْأَسْمَآءَ سے کیا مراد ہے؟ امامؑ نے فرمایا: وادیاں، کھائیاں، درے اور بیابان مراد ہیں اور اپنے ہاتھ سے زمین کی پستیوں اور بلندیوں کی طرف اشارہ کیا۔[۲]

پس معلوم ہوا کہ اس کائنات کے تمام موجودات کا وجود روح مطلق سے وابستہ ہے جو روح انسانی کی بھی حقیقت ہے اور حقائق سے متعلق علم آدم بھی حضوری علم تھا اور اگر انسان خود شناسی اور اپنے نفس میں سیر کی کوشش کرے تو اپنی اس حقیقت تک پہنچ سکتا ہے جو خدا کا نور ہے اور جس سے زمین و آسمان کا نور ہے اور اسی وجہ سے جناب آدم علیہ السلام خدا کے خلیفہ ہیں۔

خویشتن نشناخت مسکین آدمی از فزونی آمد و شد در کمی

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''خَلَقَ الْاِنْسَانَ ذَانَفْسٍ نَاطِقَةٍ اِنْ زَكّٰيهَا بِالْعِلْمِ وَ الْعَمَلِ فَقَدْ شَابَهَتْ جَوَاهِرَ اَوَائِلَ عِلَلِهَا وَ اِذَا اِعْتَدَلَ مِزَاجُهَا وَ فَارَقَتِ الْاَضْدَادُ فَقَدْ شَارَكَ بِهَا السَّبْعَ الشِّدَادُ''۔

---

۱ تفسیر عیاشی، ج۱، ص ۳۲، منقول از المیزان، ج۱، ص ۱۸۷

۲ تفسیر عیاشی، ج۱، ص ۳۳، منقول از المیزان، ج۱، ص ۱۸۴

خدا نے انسان کو باشعور اور صاحب اختیار خلق فرمایا ہے پس جب وہ علم وعمل کے ذریعہ اپنے آپ کو پاک کرلیتا ہے تو اپنی اصل سے مشابہ ہوجاتا ہے اور جب اس میں اعتدال پیدا ہوجاتا ہے اور وہ متضاد چیزوں سے الگ ہوجاتا ہے تو اس میں سات آسمانوں کی طاقتیں جمع ہوجاتی ہیں۔

روح مطلق یا روح خدا یا انسان کی حقیقت، خدا کی حجت اور برہان یعنی رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ میں بطور کامل آشکار اور ظہور سے آراستہ ہوتی ہے اور تمام اسماء کی حقیقت انہیں کے اسمائے مقدسہ سے کسب فیض کرتی ہیں۔

کتاب معانی میں امام جعفر صادقؑ سے ایک روایت نقل ہوئی ہے کہ امامؑ نے فرمایا:

خدا نے جناب آدمؑ کو اپنی حجتوں کے تمام اسماء سے آگاہ کیا، اس کے بعد وہ اسماء جو اس وقت روح کی شکل میں تھے، ملائکہ کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر تم اپنے قول میں سچے ہو کہ تم تسبیح وتقدیس کی بنا پر آدم سے زیادہ خلافت کے سزاوار ہو تو پھر مجھے ان حجتوں کے اسماء بتاؤ؟ یہ سن کر فرشتوں نے جواب دیا:

اے معبود! تو پاک ومنزہ ہے، ہمیں تو بس اتنا ہی معلوم ہے جتنا تو نے ہمیں بتایا ہے، بے شک تو سب سے زیادہ جاننے والا اور حکیم ہے۔[1]

اس کے بعد سورۂ بقرہ کی ۳۴ آیت میں خداوند عالم فرشتوں کو جناب آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا ہے لیکن شیطان سجدہ کرنے سے انکار کرتا ہے اور آدم کو صرف اور صرف ایک مادی اور خاکی پیکر میں مشاہدہ کرتا ہے، یعنی اگر انسان اپنے آپ کو صرف ایک خاکی اور مادی حقیقت سمجھے تو اس نے گویا اپنے آپ کو شیطان کی نظر سے دیکھا ہے اور اگر اپنی ملکوتی عظمت میں متحیّر ہوجائے تو فرشتوں سے بھی بالاتر ہوجائے اور اگر اس حقیقت تک پہنچ جائے کہ وہ اسماء کا مظہر اور خدا کا خلیفہ

---

[1] کمال الدین، ج۱، ص ۱۳، منقول از المیزان، ج۱، ص ۱۸۴

ہے تو اس نے اپنے آپ کو علم الٰہی کے ذریعہ پہچانا ہے۔

اگر خداوند عالم نے اس دن فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ وہ جناب آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں تو اس کی وجہ یہ تھی کہ جناب آدم علیہ السلام زمین پر خدا کے خلیفہ تھے، حقیقت میں خدا کی جانب سے سجدہ کا یہ حکم تمام انسانوں کو بھی شامل ہوتا ہے اور جناب آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا سجدہ بھی اس بنا پر تھا کہ جناب آدم، بنی نوع انسان کے قائم مقام تھے اور تمام انسانوں کی نیابت کر رہے تھے۔

خلاصہ یہ کہ جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جنت میں جناب آدم اور حوا علیہما السلام کو جگہ دینا اور پھر درخت ممنوعہ سے کھانے کی بنا پر انہیں دنیا میں بھیج دینا مثل ونمونہ ہو اس پاکیزہ زندگی کا جسے خدا نے زمین پر انسانوں کو بھیج دینے سے پہلے مقام قرب اور سایۂ قدس میں قرار دیا جو سراسر نور، انس ومحبت اور نعمت وسرور ہے جہاں روحانی اور معنوی ہم نشیں ہوتے تھے اور رب العالمین کے جوار کے ساکن ہیں، خدا نے انسانوں کو ایک ایسی ہی زندگی کو مجسم کر دیا ہے۔

شجر ممنوعہ ایک ایسا درخت تھا جس سے قریب ہونا دنیاوی زندگی کی سختیوں اور بلاؤں میں گرفتار ہونے کے مترادف ہے اور وہ بلا دنیا میں انسان کا خدا کو بھول جانا ہے اور اس کی عظمت و منزلت سے غافل ہو جانا ہے۔

خداوند عالم انسانوں سے فرماتا ہے:

"نَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُوۡحِیۡ"۔

میں نے اس مین اپنی روح پھونک دی۔

اس کلام کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسانوں کے علاوہ کائنات کی دیگر موجودات نے اپنی حیات اور ہستی غیر خدا سے مانگی ہو بلکہ کائنات کے ہر موجود میں روح الٰہی پھونکی گئی ہے اور مذکورہ آیت فقط اس ذکر کے ذریعہ انسانوں کی شرافت اور کرامت کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہے کہ اے انسان! خدا نے تیرے وجود میں اپنی روح پھونکی ہے، خدا حکیم ہے اور جس طرح وہ کوئی

بیہودہ کام نہیں کرتا اسی طرح کوئی لایعنی بات بھی نہیں کہتا، پس انسان کو اس طرح خبر دینا ضرور کسی منفعت کا حامل ہے اور وہ یہ ہے کہ اے انسان! تیرا تعلق روح الٰہی سے ہے، اس حقیقت کو جان لے اور اس حقیقت تک دوبارہ لوٹنے کے لئے جانفشانی کرتا کہ اپنی واقعی حقیقت کو حاصل کر سکے جو آیت عظمیٰ اور حق تعالی کا مکمل آئینہ ہے۔

ہبوط انسان کا راز

مذکورہ بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ پوری کائنات روح مطلق کے احاطہ میں ہے اور اس کائنات کی ہر چیز اس کے اندر وجود میں آنے سے پہلے اس عالم بالا میں تھی اور یہ اس لئے ہے کہ اس عالم بالا کا تقدم زمانی نہیں ہے اور روح مطلق سراسر خدا کا نور ہے۔

اس کائنات میں خدا نے موجود جوہر کو ملکوتی لطف سے نوازا ہے، اس سے پوری ہستی اور کائنات کی ہر شئے نے اپنا مقام اور منزلت پہنچان لیا اسی وجہ سے ہم ملکوت اعلیٰ میں سلام الٰہی کے سایہ میں وجد و سرور کے ساتھ تسبیح و تقدیس الٰہی کے ترانے میں مشغول تھے اور ہم سب حیات طیبہ کے مالک تھے:

ایرانی شاعر حافظ نے کیا خوب کہا ہے:

یاد باد آنکہ سر کوی توام منزل بود ۔۔۔ دیدہ را روشنی از خاک درت حاصل بود

راست چون سوسن گل از اثر صحبت پاک ۔۔۔ بر زبان بود مرا آنچہ تورا در دل بود

ایک دوسرے شعر میں فرماتے ہیں:

پیش از این کاین سقف سبز و طاق مینا بر کشند ۔۔۔ منظر چشم مرا ابروی جانان طاق بود

سایہ معشوق اگر افتاد بر عاشق چہ شد ۔۔۔ ما بہ او محتاج بودیم او بہ ما مشتاق بود

شعر حافظ در زمان آدم اندر باغ خلد ۔۔۔ دفتر نسرین و گل را زینت اوراق بود

ہم باغ خلد میں قاب قوسین کے جوار میں سکونت پذیر تھے، لیکن ہم سے ایسی کون سی

خطا ہوئی کہ کیوں ہم ایسے حقیر خرابے میں بھیج دیئے گئے:

"عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ الْفَضْلِ الْهَاشِمِيِّ قَالَ: قُلْتُ لِأَبِيْ عَبْدِ اللهِ: لِأَيِّ عِلَّةٍ جَعَلَ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى الْأَرْوَاحَ فِي الْأَبْدَانِ بَعْدَ كَوْنِهَا مَلَكُوْتِهِ الْأَعْلَى فِيْ أَرْفَعِ مَحَلٍّ؟ فَقَالَ: إِنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى عَلِمَ أَنَّ الْأَرْوَاحَ فِيْ شَرَفِهَا وَعُلُوِّهَا مَتَى تَرَكَ عَلَى حَالِهَا نَزَعَ أَكْثَرُهَا إِلَى دَعْوَى الرُّبُوْبِيَّةِ دُوْنَهُ عَزَّ وَجَلَّ..."[1]

عبداللہ فضل ہاشمی کہتے ہیں: میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا: کیوں خداوند عالم نے روحوں کو ایسے ابدان میں جگہ دی جب کہ وہ ملکوت اعلیٰ میں سکونت پذیر تھیں؟

امام علیہ السلام نے فرمایا: خداوند عالم کو معلوم تھا کہ اگر روحیں اس بلند و بالا مقام میں سکونت پذیر رہیں تو خود بینی کی وبا میں مبتلا ہو جائیں گی اور ربوبیت کا دعویٰ کر بیٹھیں گی۔

جو انسان جس قدر بھی اس ملکوت میں رہا اور جس حد تک خود بینی اور ربوبیت کے دعوے میں بہک سکتا تھا وہ اسی حد تک اس دنیا میں آنے کے بعد معصیت کار ہوا، یہی ہے وہ مطلب جسے ہم کہا کرتے تھے کہ اس دنیاوی زندگی سے پہلے ہماری ایک اور زندگی تھی جس کی بنیاد پر ہماری دنیاوی زندگی قائم ہے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ انسان کیوں کر عُجب اور خود پسندی میں مبتلا ہو سکتا ہے؟ اگر انسانوں کے عجب کی وجہ یہ ہے کہ اس میں نور خدا کی تابانیاں زیادہ ہیں اور خدا کی بارگاہ میں تقرب ہر مخلوق سے زیادہ ہے تو اس بنا پر بقیہ مخلوقات اس بلا میں کیوں مبتلا نہیں ہوئیں؟ پس ان دو باتوں؛ عجب و خود پسندی اور انسان کا دنیا میں بھیج دیئے

---

[1] میزان الحکمہ باب روح ذیل عنوان علو روح

جانے کے درمیان کیا تال میل ہوسکتا ہے؟

اس سوال کا جواب اگر خلاصہ کے طور پر دیا جائے تو یہ ہوسکتا ہے کہ روح انسانی کی شرافت جسے روح مطلق سے ایک خاص نسبت حاصل ہے، اس انسانی خطا کا باعث ہے۔

روح انسانی کی شرافت یہ ہے کہ اس میں اتنی توانائی ہے کہ وہ روح مطلق کے مقام تک عروج کرسکتی ہے اور بطور مطلق نور الٰہی کا آئینہ دار بن سکتی ہے۔

جب کہ انسانوں کے علاوہ دیگر مخلوقات ہمیشہ اور ہمیشہ کے لئے اپنی حدوں میں باقی رہیں گی اور ان کے لئے عروج وصعود کا کوئی مطلب باقی نہیں رہتا۔

انسانی روح کا روح مطلق کے مقام تک رسائی حاصل کرنا اور اس مقام تک عروج پانا انسان کا لامتناہی (بے نہایت) کی طرف مائل ہونا اس سے لگاؤ کی دلیل ہے، انسان اپنی حدوں پر قانع نہیں ہے اور اسی میلان ورجحان کی بنا پر شیطان سے دھوکہ کھا گیا اور اس نے انسان کو دھوکہ دے دیا، یہی عجب اور خود پسندی سبب بنی تھی جو درخت ممنوعہ سے کھانے کے لئے شیطان کی دعوت پر ظہور پذیر ہوئی پس وہ درخت ممنوعہ جس کے کھانے کی وجہ سے انسان کو جنت سے نکال دیا گیا یہی عجب تھا اور شیطانی وسوسہ کسی دوسری موجود پر کارگر نہ ہوسکا اس لئے کہ صرف انسان میں بے نہایت کے میلان ورجحان کی خصلت پائی جاتی ہے۔

اور یہ سوال کہ ہمارے عجب اور اس دنیا میں ہمارے بھیج دیئے جانے کے درمیان کیا ربط ہے؟ تو وہ ربط یہ ہے کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ جناب آدم علیہ السلام کا اس دنیا میں ہبوط کرنا صرف اور صرف شیطانی وسوسے کی وجہ سے تھا بلکہ بال سے زیادہ باریک ہزار نکتہ یہاں پوشیدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو اس دنیا میں جسم ملا ہے جسے مختلف ضرورتیں درکار ہیں اور ان سب کے علاوہ وہ اپنی ہستی کے اعتبار سے فقر ذاتی رکھتا ہے اور بطور مطلق خدا سے وابستہ ہے۔

انسان کے بے نہایت کی طرف میلان کے پیش نظر جب کہ وہ خدا سے غافل ہوجاتا

ہے اس وقت اس میں فقر و نیاز اور وابستگی پروردگار کی ذات سے غفلت اور بے نیازی کا باعث نہیں ہوتی اور اس سے انسان عجب و خود پسندی میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ اس دنیا میں خدا سے غفلت دنیوی ضرورتوں کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے اور انسان اپنی حدوں کو پار کر کے دنیوی امور میں گناہوں اور معصیت سے دوچار ہوجاتا ہے، جنود جہل جیسے غیض و غضب، شہوت، حرص، آرزو، طمع بخل، کینہ اور اس کے دیگر لشکری جو خشم و شہوت کے دنیوی مظاہر ہیں وہ سب مل کر انسان کی تشنگی اور تڑپ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور اسے عجب و خود پسندی سے نجات دلاتے ہیں۔

انسانوں کے جملہ گناہ اس وقت وجود میں آتے ہیں جب انسان کی سیر ناپذیری اس دنیا اور عالم محدود میں زیادہ خواہی کی مسیر پر گامزن ہوتی ہے لیکن گناہوں کی بھی مختلف قسمیں ہیں اور سب ایک جیسے نہیں ہوتے، خود سازی اور معرفت نفس کی راہ کو طے کرنے میں ان گناہوں کی شناخت بہت مفید ہے۔

جیسا کہ مذکورہ سطور میں بیان کیا جاچکا ہے کہ انسان عالم ذر یا عالم الست میں عجب و خود پسندی میں مبتلا ہوا تھا اور اسی خصلت کی وجہ سے اسے اس دنیا میں بھیج دیا گیا عالم ذر میں ہر انسان کی خود پسندی اس کے وجودی نقص کے برابر تھی پس انسانوں سے دو قسم کے گناہ سرزد ہوتے ہیں؛ ایک وہ گناہ ہیں جو جہالت و نادانی اور عیب و نقص کی وجہ سے صادر ہوتے ہیں، یہی وہ گناہ ہیں جو ہمارے وجودی عیب و نقص کے برابر ہیں، ایسے گناہوں کی پہچان یہ ہے کہ جب ایسے گناہوں کی جانب انسان کے وجود میں وسوسہ پیدا ہوتا ہے تو اگر یہ خیال آئے کہ اس معصیت کے انجام نہ دینے پر تمہارا نقصان ہوگا۔ اگرچہ یہ گناہ بے اختیار سرزد ہوتا ہے لیکن اس کا حساب و کتاب دوسرے قسم کے گناہوں سے بالکل جدا ہے۔

دوسرے قسم کے گناہ وہ ہیں جنہیں انجام دینے سے پہلے انہیں کرنے یا نہ کرنے کا شوق پایا جاتا ہے اور انسان ایسے گناہوں کے نہ کرنے پر خسران اور نقصان کا احساس نہیں کرتا بلکہ اس

میں سعادت کا احساس پیدا ہوتا ہے لیکن قلبی عناد کے ساتھ اور جان بوجھ کر انجام دیتا ہے۔

گناہوں کی مذکورہ دونوں قسموں کے درمیان فرق واضح ہے اس لئے کہ پہلی قسم کے گناہ جو جہالت و نادانی کی وجہ سے سرزد ہوتے ہیں، ایسے گناہوں کے ارتکاب کے بعد انسان میں ندامت، توبہ اور دوبارہ نہ کرنے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

لیکن دوسرے قسم کے گناہ جو جان بوجھ کر اور بطور عمدی انجام دیئے جاتے ہیں، ایسے گناہوں کے ارتکاب کے بعد انسان میں تسلّیٔ خاطر، توجیہ باطل اور حقیقت کی تحریف کا عنصر پایا جاتا ہے جو رفتہ رفتہ گنہگار کی سوچ میں حق سے دوری اور حق و باطل جا بجا ہونے کے موجب بنتے ہیں۔ ایسے گناہ انسانوں کے وجودی عیب و نقص کا باعث نہیں ہوتے بلکہ ایسے تمام گناہ فاسد ارادے، روح کی تحقیر اور نفس کی حقارت سے وجود میں آتے ہیں، ایسے گناہ انسان کے دل کو آلودہ کر دیتے ہیں۔

ایسے گناہوں کے سلسلہ میں علامہ فرماتے ہیں:

"وَیُعَذِّبَ الْمُنَافِقِینَ اِنْ شَاءَ اَوْ یَتُوبَ عَلَیْهِمْ"[1]

اور اگر وہ چاہے تو منافقین پر عذاب نازل کرے یا ان کی توبہ قبول کر لے کہ خدا بہت بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں خداوند عالم اس جہت سے کہ مومنین اور منافقین کے اعمال کے انجام کی طرف اشارہ کر رہا ہے اس میں ایک لطیف نکتہ پوشیدہ ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ بسا اوقات ممکن ہے انسان کے گناہ اس کی سعادت اور بخشش کا باعث ہو جائیں البتہ یہ گناہوں کی وجہ سے نہیں بلکہ انسان کے نفس کو ظلمت و شقاوت سے اٹھا کر ایک ایسی جگہ لے جاتا ہے جہاں وہ وحشت کا احساس کرتا ہے اور گناہوں کے انجام کو دیکھ کر متنبہ ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ دوبارہ اپنے

[1] سورۂ احزاب، آیت: ۲۴۔

پروردگار کی طرف لوٹ جاتا ہے... ایسی صورت میں جب نفس اس طرح متنبہ ہو جاتا ہے تو خدا بھی اس کی طرف نظر لطف کرتا ہے اور اسے بخش دیتا ہے۔

"اِنَّمَا التَّوْبَۃُ عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْءَ بِجَھَالَۃٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ"۔[1]

بے شک خدا کے نزدیک توبہ صرف اسی کے لئے ہے جو نادانی میں گناہ کرتے ہیں اور پھر توبہ کرتے ہیں۔ لغت میں جہالت کے مقابل میں علم ہے، لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ان سے جو گناہ بھی صادر ہوتا ہے وہ ان کے ارادے اور اختیار کی وجہ سے صادر ہوتا ہے اور ارادہ بھی ہمیشہ ایک قسم کے حب وشوق سے وجود میں آتا ہے۔ چاہے وہ عمل مناسب اور صحیح ہو جو عقلاء کی نظر میں قابل قبول ہو یا وہ عمل ہو جسے سماج کی روسے نہیں انجام دینا چاہیئے اور ایک سماج میں جو لوگ باشعور اور صاحب عقل ہوتے ہیں وہ ہرگز کوئی ناشائستہ عمل انجام نہیں دیتے، اسی وجہ سے عام لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جو شخص بھی شہوت یا غضب یا نفسانی خواہشات کی وجہ سے کوئی گناہ انجام دیتا ہے حقیقت میں اس سے واقعیت پوشیدہ ہے اور اس جہالت و نادانی نے دل کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے جو خوبی و بدی کو پہچاننے کے لئے بنائی گئی ہے یا دوسری تعبیر میں یوں کہا جائے کہ وہ جہالت کا شکار ہو گیا ہے اسی وجہ سے عرف عام میں لوگ ایسے شخص کو جاہل کہتے ہیں۔

اگرچہ اگر علمی عینک سے اس مسئلہ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سمجھ اور درک خود ایک علم ہے لیکن یہ گناہگاروں کو چوں کہ معصیت کے ارتکاب سے روک نہ سکا لہذا اس میں علم کی خاصیت نہیں پائی جاتی اسی وجہ سے ایسے علم کا ہونا یا نہ ہونا دونوں برابر ہے... سماج میں یہاں تک کہ ایک جوان اور کم تجربہ کار شخص (چاہے وہ کتنا ہی پڑھا لکھا کیوں نہ ہو) کو کہ جس پر جوانی کی ہوا و ہوس اور نفسانی خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے اور عاطفہ واحساس کی شہ زوری ہوتی ہے۔ جاہل شمار کیا جاتا ہے۔

---

[1] سورہ نساء، آیت ١٧

اسی وجہ سے آپ مشاہدہ کریں گے کہ سماج میں اگر خطا کرنے والا شخص اپنی خطا پر نادم نہ ہو اور نفس کی پیروی کرنے کی وجہ سے شرمسار نہ ہو تو اسے جاہل نہیں کہتے بلکہ اسے معاند و گنہگار اور اس کے عمل کو فعل عمدی قرار دیتے ہیں۔

جہل کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ جب خطاکار انسان کے دل سے تاریکیاں چھٹنے لگتی ہیں اور وہ آتش غضب یا شہوت جس نے اسے خطا کی انجام دہی پر اکسایا تھا وہ خاموش ہو جاتی ہے یا کوئی ایسا مانع اور رکاوٹ پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے گذشتہ خطا کو دوبارہ انجام نہ دے سکے تو وہ آخر میں نادم ہو جاتا ہے اور شرمساری کا اظہار کرتا ہے۔

لیکن جو خطا جان بوجھ کر اور ہٹ دھرمی سے انجام دی جاتی ہے تو چوں کہ خطا کے صدور میں انسانی عواطف، احساسات اور نفسانی خواہشات کی دخالت نہیں ہوتی بلکہ ایک ایسی چیز باعث ہوتی ہے جسے لوگ اپنے عرف میں بد ذاتی، بد طینتی اور فطرت کی پستی کا نام دیتے ہیں تو ایسی صورت میں واضح سی بات ہے کہ ایسے انسان کی طغیانی اور ہوا و ہوس ہرگز ختم نہیں ہو سکتی۔ نہ ہی سرعت سے اور نہ ہی رفتہ رفتہ بلکہ ایسا انسان جب تک زندہ ہے اس وقت تک اس کے اندر کی طغیانیت اور شیطنت بھی زندہ رہے گی، ایسا انسان ہرگز پشیمان نہیں ہوتا مگر یہ کہ اس پر خدا کا لطف ہو جائے... یہاں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کیوں مذکورہ آیت میں فرمایا: "ثُمَّ یَتُوبُونَ مِنۡ قَرِیبٍ"، یعنی وہ لوگ جلدی توبہ کر لیتے ہیں، اس قید سے ہمیں سمجھ میں آتا ہے کہ گناہ کے ارتکاب کا سرچشمہ جہالت ہو تو یہ چیز آخر عمر تک باقی نہیں رہتی۔

درج ذیل میں بیان کی جانے والی حدیث گناہوں کی پہلی قسم کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّ اللّٰہَ عَلِمَ اَنَّ الذَّنۡبَ خَیۡرٌ مِنَ الۡعُجۡبِ وَلَوۡ لَا ذَالِکَ مَا ابۡتَلَی مُؤۡمِنٌ بِذَنۡبٍ

اَبَداً"۔[۱]

بے شک خدا کو معلوم تھا کہ عجب اور خود پسندی سے کہیں زیادہ بہتر گناہ ہے وگرنہ کوئی بھی مومن ہرگز کسی بھی گناہ میں مبتلا نہ ہوتا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ فرماتے ہیں:

"لَوْلَمْ تُذْنِبُوا الَخَشِیْتُ عَلَیْکُمْ اَشَدُّ مِنَ الذَّنْبِ وَهُوَالْعُجْبُ الْعُجْبُ الْعُجْبُ"۔[۲]

اگر تم گناہ نہ کرتے تو میں تمہارے متعلق گناہ سے زیادہ شدید چیز سے خائف رہتا اور وہ عجب، عجب عجب یعنی خود پسندی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں آنحضرت قول خداوندی کو نقل فرماتے ہیں کہتے ہیں:

"لَوْلَمْ تُذْنِبُوْ الَذَهَبْتُ بِکُمْ وَ خَلَقْتُ خَلْقًا یُذْنِبُوْ نَ وَیَسْتَغْفِرُ وْ نَ فَاغْفِرُ لَهُمْ"۔

اگر تم گناہ نہ کرتے تو میں تمہاری بساط سمیٹ دیتا اور تمہاری جگہ ایک ایسی مخلوق کو لے کر آتا جو گناہ کرتی اور پھر مجھ سے بخشش کی طلبگار رہوتی اور میں انہیں معاف کرتا۔

اس حدیث کی روشنی میں یہ اہم نکتہ سمجھ میں آتا ہے کہ خداوند عالم ایسے گناہوں کو مخلوقات بلکہ اپنے فرشتوں سے بھی چھپا کر رکھتا ہے اس لئے کہ روایتوں کے مطالعہ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے گناہ اس کی خلقت میں نقص کی وجہ سے صادر ہوتے ہیں تا کہ اس طرح بندوں کے حق میں خداوند عالم کی غفاریت ثابت ہو سکے اور ہر ایک کو معلوم ہے کہ خدا کی ذات اس سے کہیں بلند و بالا ہے کہ جسے معاف کرے اسے رسوا بھی کرے۔

عالم ذرا اور عالم ملکوت میں عجب و خود پسندی باعث رہی تھی کہ انسان کی خواہشات عجب

---

[۱] اصول کافی، ج ۳، باب عجب ح ا

[۲] حسین خوارزمی شرح فصوص الحکم، مصحح: علامہ حسن زادہ آملی، ص ۱۲۹، انتشارات دفتر تبلیغات اسلامی قم

کی راہ پر لگ جائے اور اس طرح وہ ہرگز خواب غفلت سے بیدار نہ ہو اور نہ ہی معرفت ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ روح مطلق تک رسائی کا راستہ طے کر سکے لیکن اس کا اس دنیا میں ایک معین مدت کے لئے آنا اور یہاں اس کا گناہوں میں آلودہ ہو جانا، توبہ اور عمل صالح کی فرصت پانے کا اس کے لئے بہترین موقع تھا۔ ہم اس دنیا میں روح مطلق تک رسائی کا راستہ تلاش کر سکتے ہیں اور اپنا عظیم مقصد حاصل کر سکتے ہیں اور اسی دنیا میں اچھے لوگ برے لوگوں سے الگ ہو جاتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے۔

جو لوگ اس دنیا میں عمدی طور پر گناہوں سے دوری اختیار کریں اور گناہوں کے جال میں گرفتار نہ ہوں اور اگر اتفاقاً اس کے جال میں پھنس بھی گئے تو اس کے انجام و نتیجہ میں جو کہ توجیہ اور حق کی تحریف ہے ہرگز مبتلا نہ ہوں اور فرصت پاتے ہی توبہ کریں وہ بڑی تیزی سے روح مطلق کی جانب سلوک اور صعود کر سکتے ہیں اور اس طرح وہ دوبارہ اسی جنت میں لوٹ سکتے ہیں جہاں سے انہیں بھیج دیا گیا تھا۔

لیکن جو لوگ نادانی میں انجام دیئے گناہوں سے گذرتے ہوئے عمدی گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اپنے گناہوں کی توجیہ اور حق کی تحریف میں لگ جاتے ہیں وہ اندھے پن اور نادانی کا شکار ہیں اور جس جنت سے انہیں نکال دیا گیا تھا وہ دوبارہ اس جنت تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے ہیں۔

پہلی فصل میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ انسان کا راستہ خود اس کا نفس ہے جسے حق نے متعادل اور متناسب بنایا ہے، وہ بخوبی فسق و فجور کو گناہوں کی شکل میں تمیز دینے کی صلاحیت رکھتا ہے اسی طرح وہ بخوبی نیک اعمال کو ایک نیک صفت کے عنوان سے پہچانتا ہے۔

"فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا"۔

پس معلوم ہوا کہ نادانی میں انجام دیئے گناہ مسیر نفس سے خروج کا باعث نہیں ہیں بلکہ مسیر نفس میں استمرار حرکت کا نام ہے مخصوصاً جب اس کے آثار اور انجام کو ملاحظہ کیا جائے اور انہیں

نظر میں رکھا جائے، اس طرح آیہ شریفہ ''وَ نَفۡسٍ وَّ مَا سَوّٰاهَا فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَ تَقۡوٰىهَا'' کی روشنی میں نادانی میں انجام دیئے گئے گناہوں کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے، اس لئے کہ حق تعالی نے ہر نفس کو متعالی خلق فرمایا ہے اور اس کو اسی کے مقام پر رکھا ہے، اسے ہر قسم کے فسق و فجور اور عمل صالح کی تعلیم دی ہے پس اگر کسی سے گناہوں کی خباثت پوشیدہ رہے اور وہ سمجھ نہ سکے تو اس کے لئے یہ گناہ فسق و فجور کا حکم نہیں رکھتے لیکن شرط یہ ہے کہ اطلاع حاصل ہوتے ہی ان گناہوں سے توبہ کرے اور ہرگز اس پر اصرار نہ کرے، گناہ کے زہر ہلاہل کو جام شیریں سمجھ کر نوش کرنے کی کوشش نہ کرے اور جہالت کو عقلانیت پر برتری دینے کی سعی نہ کرے۔

خدا فراموشی کا نتیجہ خود فراموشی

خداوند عالم قرآن کریم میں فرماتا ہے:

''وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنۡسٰٮهُمۡ اَنۡفُسَهُمۡ اُولٰٓٮِٕكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ''۔[1]

ان لوگوں کے جیسے نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا جس کے نتیجے میں وہ اپنے نفس کو بھی بھول گئے، (یاد رکھو کہ) یہی لوگ فاسق ہیں۔

خدا کو بھول جانا حقیقت میں اپنے آپ کو اور اپنی حقیقت کو بھلا دینا ہے اور جب انسان میں یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے تو وہ اپنے سلسلہ میں غیر واقعی شناخت پیدا کر لیتا ہے اور اسے ایک قسم کا وہم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ ہلاکت کے دہانے تک پہنچ جاتا ہے۔

کلمہ ''فسق'' کا تعلق جیسا کہ بیان کیا گیا ہے؛ ایسے الفاظ سے ہے جس کے معنی نزول قرآن سے پہلے فعلی معنی میں مستعمل نہیں تھے... اس کے اصلی معنی جلد سے باہر آنا ہے، جب کہا جاتا ہے: ''فَسَقَتِ التَّمۡرَةُ'' یعنی کھجور اپنی جلد سے باہر آچکی ہے اور تقریباً اسی معنی میں قرآن نے بھی کلمہ ''فاسقین'' کو استعمال کیا ہے:

---

[1] سورۂ حشر، آیت: ۱۹

"اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللهِ مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ"۔[1]

فاسقین وہ لوگ ہیں جو خدا سے عہد باندھنے کے بعد اس کو توڑ دیتے ہیں، یہ بات واضح ہے کہ نقض عہد اسی وقت پیش آتا ہے جب پہلے سے اسے باندھا گیا ہو پس نقض عہد ایک طرح سے حقیقت میں جلد سے باہر آنا ہے۔

انسان کا واقعی لباس، بندگی کا جامۂ ملکوتی ہے اور خداوند رحمان کے آستانہ پر فقر محض ہے لیکن جب انسان اس عہد کو بھول جاتا ہے اور اس کی الٰہی بصیرت کور ہوجاتی ہے اور کردار میں عشق و عبودیت کے دستور کو بھلا بیٹھتا ہے تو وہ حقیقت میں اپنا واقعی لباس اتار دیتا ہے اور اس طرح اپنے مقام سے دور ہوتا چلا جاتا ہے، حقیقت میں وہ مقام وہم میں جہنم سے نزدیک اور خدائے رحمن سے دور ہوجاتا ہے۔

ختم ولایت تک دو راستے

اس مقام پر ہم دو دیگر مفاہیم کی وضاحت پیش کریں گے اور آپ کو ان سے آشنا کروائیں گے:

نورانی حجاب اور ظلمانی حجاب

یہ حجاب ہماری کائنات، عالم خلق میں یعنی جس دنیا میں ہم زندگی گذار رہے ہیں اس میں ہمارے وجود کے درمیان اور ہماری اصل و ریشہ یعنی روح مطلق کے درمیان ہوتا ہے، یہ فاصلہ ہماری طبیعی زندگی میں (مَیں) اور برتر زندگی میں (مَیں) یعنی روح مطلق کے درمیان دو حصوں میں منقسم ہے:

۱۔ میری طبیعی زندگی میں (مَیں) اور انسانی روح کے درمیان فاصلہ ظلمانی حجابوں سے بھرا ہوا ہے ہماری عادی زندگی میں وہ موانع اور مصروفیات جو ہمیں ہماری طبیعی روح

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت: ۲۶، ۲۷

سے غافل بنادیتی ہیں وہ سارے ظلمانی حجاب یا خلقی حجاب ہیں یعنی وہ حجاب اور موانع جو اس کائنات میں انسان کے راستے کو خود اس کی حقیقی روح تک پہنچنے سے روک دیتے ہیں اور اس راستے میں مختلف قسم کے گناہ سرزد ہوتے ہیں۔

پست اور مذموم صفات، آلودہ اوہام وافکار حتیٰ کہ وہ عام افکار کہ جن میں ملکوت اور ملکوت کے پروردگار کی جانب توجہ کی کوئی تاثیر نہیں ہوتی اور وہ افعال جن میں الٰہی اور ملکوتی نیت نہیں ہوتی، یہ سب کے سب ظلمت کے حجاب ہیں یعنی اس عالم طبیعت میں ہمارے لمحات واوقات گذرجاتے ہیں اور ہم اپنے وجود، اپنی اصل اور بنیاد سے بے خبر ہوتے ہیں۔

اپنی طبیعی خودی سے روح تک کا سفر حقیقت میں ایک اہم اور بنیادی سفر ہے جس کا تعلق مبدأ ومقصد اور معین منازل کا حامل ہے کہ جس سفر کو اصطلاح میں ''سَیرٌ مِنَ الْخَلقِ اِلَی الْحَقِ'' کہتے ہیں یعنی یہ سفر خلق سے حق کی جانب انجام پاتا ہے، یہ سفر ظلمت کے حجابوں سے طے ہوتا ہے یہاں تک کہ منزل مقصود پر ختم ہوتا ہے، اس سفر کی انتہا پر سالک تجردروح کا مالک بنتا ہے، جس کے بعد وہ روح عادی یا یوں کہا جائے کہ وہ اپنی حقیقت کی سب سے پہلی منزل کو جسے روح کہتے ہیں، درک کرتا ہے کہ اس کی حقیقت ملکوتی اور نور خدا میں فانی ہے جو انسان کی پائیدار اور ابدی ہستی ہے۔

وادیٔ عرفان میں خودشناسی کی راہ میں دوسرا مرحلہ روح عادی سے روح مطلق تک سیر کرنا ہے جسے اصطلاح میں ''سَیرٌ مِنَ الْحَقِ اِلَی الْحَقِ'' کہتے ہیں یعنی یہ سفر حق سے شروع ہوتا ہے اور حق پر ہی ختم ہوتا ہے، اس سفر میں خدا کی تجلیات کی ابتدا اور اس کے تجلیات کی انتہا تک سفر جاری رہتا ہیں، حقیقت میں جو اولیاء خدا پہلے سفر کو طے کر لیتے ہیں وہ اولیاء خاصِ الٰہی کے عروج وکمال کے انتہائی مقامات تک پہنچنے کے لئے دوسرے سفر کا آغاز کرتے ہیں تا کہ ان میں خدا کے خاص اولیاء کے صفات وحالات پیدا ہوجائیں، عادی روح اور مطلق روح کے درمیان فاصلہ

نوری یا امری حجابوں سے بھرا ہوتا ہے۔

یہ وہ حجاب ہیں جن کی کیفیت ونوعیت کو یہاں بیان کرنا بہت دشوار ہے اور اس سفر کے مراحل کو طے کرنے میں انسان معذور اور بے بس ہو جاتا ہے۔

یا اگر کہا جائے تو علامہ کا بیان نقل کرنا بہتر ہوگا۔

من بہ سرچشمہ خورشید نہ خود بردم راہ ذرہ ای بودم و مہر تو مرا بالا برد

من خس بی سر و پایم کہ بہ سیل افتادم او کہ می رفت مرا ہم بہ دل دریا برد

اس سفر کی ان منزلوں کو طے کرنے کا آغاز ائمہ معصومین علیہم السلام کی مدد ونصرت اور لطف وعنایت سے میسر ہوتا ہے۔

پہلے سفر میں سب سے پہلے عمدی گناہ ترک ہوتے ہیں اور جاہلانہ گناہ جو انسان کے وجودی نقص کی وجہ سے سرزد ہوتے ہیں وہ دوسرے سفر تک ایک حد تک باقی رہتے ہیں لیکن جیسے ہی انسان روح مطلق سے نزدیک ہوتا ہے اور اس کے حریم میں وارد ہوتا ہے تو چوں کہ وہ حریم عصمت میں وارد ہوتا ہے لہٰذا اس کے وجود سے ہر قسم کی شقاوت وجہالت دور ہو جاتی ہے، یہ وہ مقام ہے جسے خدا نے اپنے خاص اولیاء سے مخصوص کر دیا ہے جو اس کے کمال اور عز وشرف میں فانی ہوتے ہیں، جو نہ اس عالم میں اور نہ ہی اپنے وجود میں کسی غیر کو مشاہدہ کرتے ہیں اور جس طرح آنحضرتؐ کے اہلبیت علیہم السلام نور واحد ہیں اور یہ نور حقیقت میں خدا کا نور ہے، پس جو مومنین اور عرفاء اس مقام ومرتبہ میں وارد ہوتے ہیں اور اسے حاصل کر لیتے ہیں وہ حقیقت میں اسی نور سے ہیں اور ان کے درمیان کوئی دوگانگی وبے گانگی نہیں ہوتی۔

درج ذیل روایت، مومنین کے اس گروہ کو بخوبی بیان کرتی ہے اور اس پر گواہ ہے:

"اَلْمُؤْمِنُ اَخُو الْمُؤْمِنِ كَالْجَسَدِ الْوَاحِدِ اِذَا اشْتَكَىٰ شَيْئاً مِنْهُ وَجَدَ اَلَمَ ذَالِكَ فِيْ سَائِرِ جَسَدِهٖ وَ اَرْوَاحُهُمَا مِنْ رُوْحٍ وَاحِدَةٍ وَاَنَّ رُوْحَ الْمُؤْمِنِ لَاَشَدُّ اِتِّصَالاً

بِرُوحِ اللہِ مِنْ اِتِّصَالِ شُعَاعِ الشَّمْسِ بِهَا"۔[1]

ایک مومن دوسرے مومن کا بھائی ہوتا ہے بالکل ایک بدن کی طرح کہ جوں ہی بدن کے کسی حصہ میں درد ہوتا ہے تو اس کے مابقی اعضاء اس درد کا احساس کرتے ہیں، ان دونوں کی روحیں ایک ہوتی ہیں اور روح الٰہی سے مومن کی روح کا اتصال، سورج سے اس کی شعاعوں کے اتصال سے کہیں زیادہ اٹوٹ ہوتا ہے۔

اصل کی جانب بازگشت

روح مطلق ایک ایسی عظیم حقیقت کا نام ہے جو صرف اور صرف خدا سے متعلق اور اسی سے منسوب ہے، حقیقت میں خدا کی مخلوقات کے درمیان روح مطلق ایک ایسی مخلوق ہے جو بغیر واسطہ کے خلق ہوئی ہے اور جو نہ کسی زمانہ سے مخصوص ہے اور نہ کسی مقام سے، پوری کائنات کی ہستی کو اس کے وجود میں لکھ دیا گیا ہے اور انسانوں کی عادی روح حقیقت میں روح مطلق سے متصل ہے جیسا کہ قرآن میں اللہ نے فرمایا:

"وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي"۔

اور میں نے اس میں اپنی روح پھونک دی۔

ملائکہ، حیوانات اور نباتات کی روحیں بھی روح مطلق کا ادنی مرتبہ رکھتی ہیں بلکہ اس عالم میں جو کچھ بھی ہے، ان سب کی حیات خدا کے اذن سے اور اسی روح مطلق کی فیض رسانی سے ہے اور اسی نے انہیں زندگی اور حیات بخشی ہے لیکن انسانی روح کو روح مطلق سے نسبت کی بنا پر ایک خاص شرف حاصل ہے جو بقیہ روحوں کو حاصل نہیں ہے اور اسی نکتہ کی وجہ سے خدا نے فرمایا:

"وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي"۔

اور میں نے اس میں اپنی روح پھونک دی

---

[1] اصول کافی، ج، ص ۱۶۴

اس آیت میں خدا نے "روحی" یعنی میری روح کی تعبیر استعمال کی ہے اور یہ اضافت حقیقت میں اضافت تشریفی ہے جس سے دیگر مخلوقات کی روحوں کے مقابلے میں انسانی روح کی شرافت وکرامت سمجھ میں آتی ہے اس لئے کہ انسانی روح میں اتنی توانائی ہوتی ہے کہ وہ معرفت کے ذریعہ عظیم و بے مثال اور طیب وطاہر روح سے ملحق ہوجائے اور اس کو پالے جیسا کہ مناجات شعبانیہ میں وارد ہوا ہے؛

"اِلٰهِی هَبْ لِیْ کَمَالَ الْاِنْقِطَاعِ اِلَیْکَ وَ اَنِرْ اَبْصَارَ قُلُوبِنَا بِضِیَاءِ نَظَرِهَا اِلَیْکَ حَتّٰی تَخْرِقَ اَبْصَارُ الْقُلُوْبِ حُجُبَ النُّوْرِ فَتَصِلَ اِلٰی مَعْدِنِ الْعَظَمَةِ وَ تَصِیْرَ اَرْوَاحُنَا مُعَلَّقَةً بِعِزِّ قُدْسِکَ"۔

بار الہا تو اپنے غیر سے کمال جدائی کو اور اپنی طرف حرکت کو ہمیں نصیب فرما! اپنے جمال کے دیدار سے ہماری آنکھوں کو روشن ومنور فرما! تا کہ نوری حجابات کو ہٹا کر تیرے معدن عظمت وجلالت سے ملحق ہوجائے اور ہماری روح منقلب ہو کر تیرے گوشوارۂ عز وقدس سے آویزاں ہوجائے۔

انسان روح مطلق کے مقام پر فائز ہونے کے بعد عاشقی وبندگی کے اصول کی رعایت کرتے ہوئے ولایت کے اعلی مدارج کو طے کرسکتا ہے اور اس طرح روح مطلق کے باطن میں قدم رکھ سکتا ہے، یہ مقام اس قدر عظیم اور بلند وبالا ہے بلکہ معراج سے کہیں زیادہ بااہمیت ہے کہ مقرب فرشتے یہاں تک کہ جبرئیل جیسا فرشتہ بھی روح مطلق کے باطن تک صعود وعروج سے عاجز اور بے بس نظر آتا ہے، شب معراج جب پیغمبر اکرمؐ اس مقام پر پہنچے تو جبرئیل اس مقام پر ٹھہر گئے اور فرمایا: اگر میں اس کے بعد ایک قدم بھی بڑھاؤں گا تو جل جاؤں گا، روح مطلق اور فیض حق در واقع انسان کی سیر کی آخری حد ہے اور اس مقام تک بلند ہمت طالبان حقیقت اور بے مثال لوگوں کے سوا کسی میں پہنچنے کی طاقت نہیں ہے، یہ مقام حقیقت میں خدا کے اولیاء سے مخصوص ہے جو ہر

شئے سے دل برداشتہ ہیں اور اس حقیقت کو سمجھ چکے ہیں کہ اس عالم میں غیر حق جو کچھ بھی ہے وہ سب کچھ فانی اور باطل ہے اور ان میں سے کسی کے پاس اس کائنات میں تصرف اور تاثیر کی طاقت نہیں ہے۔

روح مطلق خدا کے تمام اسماء وصفات کی مظہر ہے کہ اگر کوئی اس کے باطن میں داخل ہو جائے تو خدا کی کما حقہ تعریف کرے گا:

"سُبحَانَ اللهِ عَمَّا يَصِفُونَ"۔[1]

خداوند عالم تعریف کرنے والوں کی تعریف سے منزہ ہے۔

روح مطلق حقیقت میں پیغمبر اکرمؐ اور آپ کے اہلبیت علیہم السلام کے انوار کی روح ہے اور ہم اپنی عادی اور معمولی روح کے ہمراہ دم بہ دم اس روح عظیم سے فیضیاب ہوتے رہتے ہیں اور اس کائنات میں ہمارا ہر قدم اور ہر سانس گویا روح اعلیٰ سے نزدیک ہونے کے لئے ہے تاکہ اس سے ملحق ہو جائیں جیسا کہ زیارت جامعہ میں وارد ہوا ہے:

"وَاِيَابُ الْخَلْقِ اِلَيْكُمْ"۔

اے اہلبیت! تمام مخلوقات کی باگشت آپؑ کی طرف ہے۔

پس جنہوں نے ایمان کامل اور عمل صالح کا ذخیرہ جمع کر لیا ہے اور روح اعظم کی حمایت میں شامل ہو چکے ہیں اور ایمان کے مناروں تک پہنچ چکے ہیں وہی لوگ روح الٰہی کو درک کر سکتے ہیں اور وہی لوگ اس کے وصال سے ہمکنار اور اس میں فانی ہو سکتے ہیں۔

لیکن جو لوگ غفلت اور شہوت میں مستغرق ہو گئے اور اس تک پہنچتے پہنچتے خام رہ گئے ایسے ہی لوگ اس کے ادراک اور دیدار سے ناتوان اور نابینا رہیں گے۔

جس دن روح اعظم اپنے رخ سے پردہ اٹھائے گی اور ملائکہ صف باندھے کھڑے

---

[1] سورۂ صافات، آیت: ۱۵۹، ۱۶۰

ہوں گے اس دن بینا و نابینا، مومن و فاسق، مردہ و زندہ اور دانا و نادان ہرگز برابر نہ ہوں گے اور ان کا حساب ایک جیسا نہ ہوگا۔

"يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ مَآبًا إِنَّا أَنْذَرْنَاكُمْ عَذَابًا قَرِيبًا يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا"۔[1]

روح مطلق ہمارے وجود کی اصل ہے اور خدا کے آگاہ بندے اسی کی تلاش میں خاک چھانتے رہتے ہیں۔

ہر کسی کو دور ماند از اصل خویش باز جوید روزگار وصل خویش

۲۰/اکتوبر ۲۰۰۲ء

والسلام

[1] سورہ نبا، آیت ۳۸۔۴۰